جنگ آزادی کی نوعیت

اب ہم اپنی آخری تنقیح کی طرف توجہ کرتے ہیں، یعنی یہ کہ وطن پرستوں کی یہ جنگ جسکو "جنگ آزادی" کہا جارہا ہے، دراصل ہے کس نوعیت کی جنگ؟ آیا یہ خالص انقلابی جنگ ہے یا نیم انقلابی اور نیم دستوری؟ عام طور پر سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں، حالانکہ یہ سوال فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

انقلابی جنگ کے معنی یہ ہیں کہ حکومت متسلطہ کو بالکلیہ ختم کر دینے کیلیے جنگ کی جائے، اور جب تک اسکا تختہ الٹ نہ دیا جائے، اسوقت تک ملک کے نظم ونسق سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی عمارت کو بالکل ناپسند کرتے ہوں اور اس میں رہ کر آہستہ آہستہ ترمیم کرنے کے قائل نہ ہوں، بلکہ اسکو قطعی طور پر منہدم کر کے دوسری عمارت بنانا چاہیں۔

نیم انقلابی نیم دستوری جنگ کے معنی یہ ہیں کہ پہلے انقلابی شورش سے حکومت متسلطہ پر دباؤ ڈال کر نظام حکومت میں ترمیم واصلاح کرائی جائے، پھر اصلاح شدہ نظام کو چلا کر اتنی طاقت حاصل کی جائے کہ دوبارہ انقلابی شورش برپا کر کے کچھ مزید اختیارات حاصل کیے جاسکیں، اور اس طرح بتدریج پرانے نظام حکومت کو ہٹا کر نیا نظام حکومت اسکی جگہ لیتا چلا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ ایک عمارت کو رفتہ رفتہ توڑتے جائیں اور ساتھ ساتھ دوسری عمارت بناتے بھی جائیں، یہاں تک کہ پرانی عمارت کا انہدام اور نئی عمارت کی تکمیل دونوں ساتھ ساتھ انجام کو پہنچیں۔

دونوں طرح کی لڑائیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی قسم کی لڑائی میں دو ایسے فریق بھی

مل کر لڑ سکتے ہیں جو موجودہ نظام حکومت کی مخالفت میں تو متفق ہوں مگر اس امر میں اختلاف رکھتے ہوں کہ آئندہ نظام حکومت کس نقشہ پر بنایا جائے۔ انکے لیے یہ ممکن ہے کہ تعمیر نو کے سوال کو جنگ کے خاتمہ پر اٹھا رکھیں۔ وہ اس امر پر اتفاق کر سکتے ہیں کہ آؤ، ہم متحدہ قوت کے ساتھ پہلے اس نظام حکومت کو ختم کر دیں، اسکے بعد یا تو ہم باہمی مفاہمت سے کوئی بیچ کی راہ نکال لینگے، یا پھر بدرجۂ آخر قوت آزمائی کر دیکھینگے، اور ہم میں سے جو فریق بھی زیادہ طاقت ور ہوگا اسکی مرضی کے مطابق نیا نظام حکومت بن جائیگا لیکن دوسری قسم کی لڑائی میں آئندہ کے سوال کو بعد پر اٹھا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اس میں تو فریقین کے درمیان پہلے ہی مرحلہ پر یہ تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تدریجی تخریب کے ساتھ تدریجی تعمیر کس نقشہ پر ہو۔ اس لیے کہ یہاں تخریب اور تعمیر دونوں ساتھ ساتھ ہو رہی ہیں اور ساتھ ساتھ تکمیل کو پہنچنے والی ہیں۔ اگر ایک فریق اپنے نقشہ پر تعمیر کرتا رہے اور دوسرا فریق نقشہ کے سوال کو بعد پر چھوڑ کر اسکا ساتھ دیتا چلا جائے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک غلامی کے بند کھولنے کیساتھ دوسری غلامی کے بند میں اپنے آپ کو خود جکڑواتا رہے اور اپنی آزادی کے سوال کو اسوقت کیلیے اٹھا رکھے جب یہ دوسری غلامی اس پر پوری طرح مسلط ہو چکی ہو۔ اس قسم کی جنگ اُس عقلمند فریق کیلیے تو ضرور جنگ آزادی کہی جا سکتی ہے جو آہستہ آہستہ پرانے آقا کی جگہ لے رہا ہو، مگر اُس بے وقوف فریق کیلیے یہ دراصل جنگ غلامی ہوگی جو ایک آقا کی جگہ محض دوسرا آقا لانے کیلیے لڑ رہا ہو۔

اگر ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد فی الواقع خالص انقلابی نوعیت کی ہوتی تو ہم اسکی کوئی پروا نہ کرتے کہ مستقبل کا نقشہ پنڈت جواہر لال اور سوبھاش چندر بوس کیا پیش کرتے ہیں اور بھولا بھائی دیسائی اور ستیا مورتی کیا فرماتے ہیں۔ ہم بزدل ہوتے اگر ان باتوں سے ڈر کر جنگ سے منہ موڑ جاتے۔ ہم بہادروں کیطرح ان سے کہتے کہ جو کچھ آپ حضرات کے ارادے ہیں آپ انہی پر قائم رہیں، مگر آئیے پہلے ہم اور آپ مل کر اس بد اصل عمارت کو تو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں جسے باہر والوں نے ہمارے سروں پر تعمیر

کردیا ہے۔ اسکے بعد ہم دیکھ لینگے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنتا ہے یا کچھ اور۔ اس صورت میں جو فریق بھی آزادی کامل (بیرونِ سایۂ سلطنت برطانیہ) کیلیے انقلابی لڑائی سے منہ پھیرتا وہی بزدل قرار پاتا۔

مگر یہاں صورت حال کچھ دوسری ہے۔ نام آزادی کامل کا لیا جاتا ہے، اور منزل مقصود ٹھہرائی جاتی ہے کینڈا اور آسٹریلیا کی سی آزادی (یعنی برٹش کامن ویلتھ کے اندر نہ کہ باہر)۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ہماری جنگ انقلابی ہے اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہی نیم انقلابی نیم دستوری جسکا مفہوم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم دوسروں کے بنائے ہوئے دستور کو قبول کرنے کیلیے ہرگز تیار نہیں ہیں، اور انکے مسلط کیے ہوئے نظام کو توڑ کر ایسا دستور چاہتے ہیں جو ہندوستان کے باشندے خود اپنے لیے بنائیں، مگر دوسروں نے جو دستور بنا دیا ہے اس کو عملاً قبول کر کے حکومت کے نظم و نسق کا چارج لے لیا جاتا ہے، اور خوب دل لگا کر اسے چلایا جاتا ہے۔ اس طرح ایک عجیب پر فریب طلسمی جال تیار کر دیا گیا ہے جسکے پھندے دن کی روشنی میں بھی ہمارے بہت سے بھائیوں کو نظر نہیں آتے۔ لہذا ضرورت ہے کہ اس جال کے ایک ایک پھندے کو پوری طرح نمایاں کیا جائے تاکہ مادر زاد اندھوں کے سوا ہر ایک اسکو دیکھ سکے۔

(۱)

آزادی کامل، (پورن سوراج Complete Independence) کے الفاظ سن کر ہر ذی ہوش آدمی یہی سمجھے گا کہ اس سے مراد وہ آزادی ہے اور وہی آزادی ہونی چاہیے جو فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس اور ایسے ہی دوسرے آزاد ملکوں کو حاصل ہے۔ لیکن ہندوستان میں ان الفاظ کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ یہاں احرار تو انہی الفاظ کے استعمال پر کیا جاتا ہے، لیکن اگر انکی تعبیر بیرونِ سایۂ عاطفت برطانیہ کے ساتھ کر دی جائے تو مہاتما گاندھی پران دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں آج بھی اس سے مراد وہی ہے جسکو آج سے دس سال پہلے نہرو رپورٹ میں مطلوب و مقصود ٹھہرایا گیا تھا، یعنی برطانوی دولت

مشترکہ میں خود مختار نوآبادیات کی سی حیثیت ۔ مگر اب اس کو نہرو رپورٹ کی طرح صاف الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا بلکہ زیادہ تر کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اسکی تشریح و تفسیر کی نوبت ہی نہ آئے، اور اگر کبھی مجبوراً کچھ کہنا پڑ جاتا ہے تو پھر یونانی زبان میں کلام کیا جاتا ہے تاکہ کوئی نہ سمجھ سکے ۔ تاہم انتہائی سعی اخفا کے باوجود اصل مقاصد کسی نہ کسی طرح زبان پر آ ہی جاتے ہیں ۔ چنانچہ اسی سال ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں مسٹر سوبھاش چندر بوس نے فرمایا ہے :

"برطانوی سلطنت اس وقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک دوراہے پر کھڑی ہے ۔ یا تو وہ اُسی انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہو چکا ہے، یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا ۔ . . . . برطانیہ عظمیٰ کیلیے اپنے نظام سلطنت کے اندرونی تضاد و تباین کو ختم کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کر دے"

ابھی حال میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک مضمون یورپ کی صورت حال پر شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں :-

"اگر برطانیہ جمہوریت کا اب بھی معتقد ہے تو اسکے لیے ایک ہی ممکن العمل صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ قیصریت کو جلدی سے جلدی اور بالکلیہ ترک کر کے ہندوستان اور فلسطین وغیرہ میں آزاد جمہوری ادارے قائم کر دے ۔ اس سے برطانیہ کمزور نہ ہوگا بلکہ یہ ممالک اسکے طاقت ور مددگار بن جائینگے" (نیشنل ہیرلڈ بحوالہ نیشنل کال مورخہ ۱۴ نومبر ۳۸ء)

اور اسی سال اگست میں پنڈت جی پراگ (Prague) تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے ایک بیان میں فرمایا کہ :

"انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں" (ٹریبیون مورخہ ۱۹ اگست ۳۸ء)

ٹریبیون ہی کا بیان ہے کہ اس پر انڈیا آفس کی طرف سے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا ۔

یہ کانگریس کے اُن دو لیڈروں کے اقوال ہیں جو انتہا پسند کانگریسیوں کے صنم سمجھے جاتے ہیں، جن میں سے ایک اسوقت کانگریس کا صدر ہے اور دوسرا ابھی مسلسل دو سال تک صدر رہ چکا ہے۔ ان کا مطمح نظر بھی اس سے زیادہ اونچا نہیں ہے کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کے اندر آزاد قوموں کے اُس دائرے میں جگہ پالے جسکا مرکز و محور تاج برطانیہ ہو، جسکا مفاد مرکزی سلطنت کے مفاد سے متحد ہو جائے، جس کی دفاعی، اور لازمی نتیجہ کے طور پر، خارجی پالیسی بھی انگلستان کے دامن سے بندھی ہوئی ہو ــــ یہی رائے قریب قریب تمام بڑے بڑے کانگریسی رہنماؤں کی ہے، اور ان میں کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہیں مل سکتا جو آزادئ کامل بول کر آزادئ کامل مراد لیتا ہو۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی آزاد قوموں کے ساتھ ہمسری و مساوات حاصل کرنے کی خواہش، جو فطرۃً ہر خوددار ہندوستانی میں ہونی چاہیے، انکے اندر مفقود ہے۔ بلکہ دراصل اسکی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایک کھلی اور بے لاگ مسابقت (Open and Fair Competition) کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ یہ اسکے لیے تیار نہیں ہیں کہ کھلے میدان میں گھوڑا کھڑا ہو، مقابلہ آزادانہ ہو، اور ان کا اس گھوڑے کی پیٹھ پر متمکن ہونا محض انکی قوت و شہسواری پر موقوف ہو۔ ان کی خواہش تو یہ ہے کہ سرکار سہارا دیکر انہیں گھوڑے پر چڑھا دیں اور جب تک یہ دوسرے امکانی مدعیوں کا خاتمہ نہ کر دیں، یا جب تک وہ انکی سیاسی قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اس وقت تک سرکار انکی پشتیبانی کیلیے کھڑے رہیں۔ یہ اور صرف یہی ایک وجہ ہے اس امر کی کہ ان کے بڑے سے بڑے مدعی حریت کو بھی جب اوپر سے کھرچا جاتا ہے تو اندر سے وہ درجۂ نوآبادیات کا پرستار ہی نکلتا ہے۔

پھر جب ان کا اصلی مدعا یہ ہے تو آخر یہ آزادئ کامل کا نام کیوں لیتے ہیں؟ لبرل پارٹی کی طرح صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم درجۂ نوآبادیات چاہتے ہیں؟ آخر اس منافقت کی ضرورت کیا ہے کہ زبان پر وہ بات لائی جائے جو دل میں نہیں ہے اور دل میں وہ بات رکھی جائے جو زبان پر لانی مناسب نہیں؟

خصوصاً وہ لوگ جنکے ایمان میں اھنسا سے بھی پہلے ستیہ (صداقت) کا مرتبہ ہے وہ اس جھوٹ کو کیوں جائز رکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جو گذشتہ دس سال کی تاریخ پر غور کرنے سے مجھے ملا ہے اسے میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ظاہر کر دینا چاہتا ہوں - اس منافقت کی وجہ صرف یہ ہے کہ درجۂ نوآبادیات یا اس سے فروتر درجہ کی اصلاحات کا نام لیتے ہی فوراً ملک کی دوسری قوموں کے حقوق کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں خود بڑی مشکل پیش آتی ہے - اگر ان حقوق کے مسائل کو انصاف کے ساتھ ابتدائی مراحل ہی میں طے کر دیا جائے تو ہندوستان کو "ایک قوم" کا ملک بنا دینے کا خواب پریشان ہو جاتا ہے، اور اگر اپنے اصل ارادے بے نقاب کر دیئے جاتے ہیں تو پھر اس دام فریب کے سارے بند کھل جاتے ہیں جس میں ہندوستان کی دوسری قوموں کو پھانسنا مقصود ہے، اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ حقیقی "بندگان وطن" کی قلیل تعداد کے سوا کوئی ایسا "بندۂ خدا" بھی اس کام میں تعاون کا ہاتھ بڑھائیگا جو اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتا ہو - اس دوگونہ اشکال کا عملی تجربہ ان حضرات کو نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد اچھی طرح ہو گیا تھا - چنانچہ انہوں نے یہ دانشمندانہ پالیسی اختیار کی کہ نہرو رپورٹ کو تو دریائے راوی میں غرق کر کے "آزادیٔ کامل" کا اعلان کر دیا، اور اس جھوٹ کے پردے میں اپنے اصل مقصد، یعنی تدریجی حصول اقتدار کی کوشش برابر جاری رکھی -

اگرچہ جاننے والوں کیلیے یہ راز اُسوقت بھی راز نہ تھا - اور جنکے پاس کچھ عقل تھی انکے لیے اسکے بعد بھی بہت سے مواقع آئے جب اسکے چہرے سے نقاب اٹھتا رہا - مثلاً جب سول نافرمانی کے بعد گاندھی جی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن تشریف لے گئے تھے تو کامل آزادی لینے کے لیے نہ گئے تھے، نہ کامل آزادی دینے کے لیے ان کو بلایا گیا تھا - ....

...... اور جب ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کر دیا گیا تو جدید اسمبلیوں میں داخلہ کامل آزادی حاصل کرنیکا ذریعہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا - مگر باوجود اسکے یہ راز ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائیوں کیلیے

راز ہی رہا اور آج بھی جبکہ برطانوی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے دستور کو علانیہ چلایا جا رہا ہے، انکے لیے یہ بدستور راز ہے، چنانچہ وہ متحدہ قومیت کے راگ ہی سمجھ کر الاپ رہے ہیں، اور ماس کانٹیکٹ کے جال میں مسلمانوں کو یہی سمجھ کر پھنسوا رہے ہیں کہ کانگریس کی جنگ کامل آزادی کیلیے ہے ـــــ یہ فائدہ ہے اس منافقت کا جو ستیہ اور اہنسا کے معتقدین نے آٹھ نو سال سے اختیار کر رکھی ہے۔

(۲)

جب آزادیٔ کامل کا اعلان کیا گیا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی کہدیا گیا تھا کہ ہماری جنگ انقلابی جنگ ہے، یعنی ہم اس ظالمانہ نظام حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں اور جب تک وہ جڑ سے اکھڑ نہ جائے، اس سے کوئی ربط و تعلق رکھنے کیلیے تیار نہیں ہیں۔ بات بظاہر نہایت معقول تھی۔ کیونکہ آزادی کامل صرف انقلابی جنگ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو یقین آ گیا کہ جب یہ انقلابی جنگ کا علم بلند کر رہے ہیں تو ضرور ان کا مقصد آزادیٔ کامل ہی کا حصول ہوگا۔

اس کے بعد جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو گیا اور جدید اسمبلیوں کیلیے انتخابات شروع ہوئے تو کہا گیا کہ ہم اسمبلیوں میں جائینگے مگر اسلیے کہ اس دستور کو اندر سے توڑیں۔

پھر جب اسمبلیوں میں پہنچ گئے تو وزارتیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ کچھ مدت تک محبوبانہ ادا کے ساتھ ہاں اور نہیں کا سلسلہ جاری رہا اور آخر کار وزارت کی قلمدان بھی سنبھال لیے گئے۔

جب وزارتیں بھی قبول کر لی گئیں تو کہا گیا کہ اس سے مقصود ہز میجسٹی کی حکومت کو چلانا نہیں ہے بلکہ دستور جدید کے نفاذ کو عملاً ناممکن بنا دینا ہے۔ چنانچہ عہدے قبول کرتے وقت کانگریس نے جس پالیسی کا اعلان کیا تھا وہ یہ تھی کہ:

"دستور جدید کا مقابلہ کر کے (یا اسکی مزاحمت کر کے) اسے ختم کر دیا جائے۔ دوسروں کی بڑی اکثریت کانگریس

کی اس پالیسی اور اسکے پروگرام کی توثیق کر چکی ہے - عوام الناس خود برطانوی حکومت ہی کے مقرر کیے ہوئے طریقہ پر آئین جدید کو نامنظور کرنیکا اعلان کر چکے ہیں (یعنی انہوں نے کانگریس کے نمائندوں کو بھاری اکثریت سے نمائندہ منتخب کیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ وہ اس دستور کو قبول نہیں کرتے) - وہ صاف طور پر اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم اپنا دستور حکومت خود بنانا چاہتے ہیں ...... لہذا باشندگان ہند کی جانب سے کانگریس اس دستور کو از اول تا آخر مسترد کرتی ہے ...... کانگریس اپنے تمام ارکان پر واضح کر دینا چاہتی ہے کہ مجالس قانون ساز میں ان کا کام اس دستور کا مقابلہ کرنے اور اسے ختم کر دینے کی پالیسی پر مبنی ہونا چاہیے ...... اس پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت برطانیہ کیلیے اس دستور کو نافذ کرنا غیر ممکن ہو جائیگا ...... اسی پالیسی کو مد نظر رکھتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنے نمائندوں کو ان صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے جنکی مجالس قانون ساز میں ان کو اکثریت حاصل ہے "

لیکن آج عملاً کیا ہو رہا ہے؟ اور عملاً کو بھی چھوڑیئے، وہی زبانیں جو پچھلے سال کے وسط تک دستور کو توڑنے کا اعلان کر رہی تھیں، آج بلا کسی شرم و لحاظ کے کیا کہہ رہی ہیں؟ اس کا جواب ہم سے نہیں خود انہی زبانوں سے سن لیجیے - سردار ولبھ بھائی پٹیل ہری پورہ کانگریس کے بھرے اجلاس میں فرماتے ہیں:

" چند مہینوں کی مختصر مدت میں کانگریسی وزارتوں نے اس سے زیادہ کام کیا ہے جتنا برطانوی حکومت گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں کر سکی تھی " (ٹائمز آف انڈیا - مورخہ ۲۳ر فروری ۳۸ء)

یعنی وہی دستور جو بالکل ناکارہ تھا اس قدر کارآمد بن گیا! اور سنیے - کانگریس کے صدر مسٹر سوبھاش چندر بوس فرماتے ہیں:

" کانگریس محض تخریبی طریق کار پر اعتقاد نہیں رکھتی بلکہ اندر رہ کر تعمیری طریق کار کو انسب سمجھتی ہے " (ٹریبیون مورخہ ۱۵ر جون ۳۸ء)

اس سے بھی زیادہ کھل کر مسٹر بوس نے ابھی حال میں آسام کے قضیۂ وزارت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس امر کی شکایت کی تھی کہ جب یورپین گروپ ملک معظم کی حکومت کو چلانے کیلیے ہے تو وہ کانگریس پارٹی کی مخالفت پر کیوں کمربستہ ہوگیا، درانحالیکہ کانگریس پارٹی بھی اس حکومت کو چلانے ہی کیلیے وزارت سنبھال رہی ہے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب دستور کو توڑنے کے بجائے اسکو چلانے کی بالبسی علانیہ اختیار کی جاچکی ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ آج ڈیڑھ سال سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی حدود کا پورا پورا لحاظ رکھ کر ہز میجسٹی کی حکومت چلائی جارہی ہے کہ کانگریسی وزارتیں اگر حقیقت میں دستور کو توڑنا چاہتیں تو انکے لیے بہت آسان تھا کہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کیلیے ایسی تدابیر اختیار کرتیں جنکی اجازت دینے سے گورنر انکار کردیتے، اور پھر اس پر استعفےٰ دیکر آئینی انقباض (Deadlock) پیدا کردیتیں۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پوری وفاداری کیساتھ اس دستور کو اسی طرح چلا رہی ہیں جسطرح کوئی لبرل جماعت چلاتی۔ وہ پوری کوشش کررہی ہیں کہ گورنروں سے تصادم نہ ہونے پائے خواہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے وہ بہت سے کام رہ جائیں جنکا انہوں نے وعدہ کرکے عوام سے ووٹ حاصل کیے تھے۔ انہوں نے عوام سے کہا تھا کہ ہم شرح مالگذاری میں ۵۰ فی صدی کمی کردینگے۔ مگر کس صوبہ میں تخفیف کی گئی؟ یوپی میں جب اس وعدہ کو یاد دلایا گیا تو وزارت نے صاف جواب دیدیا کہ سابقہ حکومت جتنی تخفیف کرچکی ہے اس سے زیادہ نہیں کی جاسکتی[1]۔ اور یہ صرف اسلیے کہ مالگذاری کم کرنے سے بجٹ کا توازن بگڑتا ہے، اور بجٹ کا توازن بگڑنا اس سامراج کے مفاد کے خلاف ہے جسکی وفادارانہ خدمت انجام دینے کیلیے یہ حضرات ایوان وزارت میں تشریف لے گئے ہیں۔

انہوں نے عوام کو سبز باغ دکھایا تھا کہ ہم تمہاری غریبی کا علاج کرینگے۔ مگر کون صداقت پسند

[1] ملاحظہ ہو نیشنل کال مورخہ ۱۳ر جولائی ۳۸ء۔

آدمی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ احمد آباد، شولاپور، کانپور، بمبئی وغیرہ مقامات پر کانگریسی حکومتوں نے مزدوروں کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ سابقہ حکومت کے ظالمانہ برتاؤ سے کچھ مختلف ہے؟ اور اس پر طرفہ ماجرا یہ ہے کہ غریب مزدور اگر اپنے حقوق تسلیم کرانے کیلیے ہڑتال یا پکٹنگ کرتے ہیں تو وہی گاندھی جی جو ان سب ہتھیاروں کو برٹش گورنمنٹ کے خلاف استعمال کر چکے ہیں، ان پر تشدد کا الزام عائد کرتے ہیں اور بے تکلف فرماتے ہیں کہ "کارخانہ دار انکے خلاف پولیس سے امداد طلب کرنے میں اور کانگریسی حکومت ایسی امداد بہم پہنچانے میں بالکل حق بجانب ہیں"[1]۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اُن ظالمانہ قوانین کو منسوخ کرائینگے جو انگریزی حکومت نے نافذ کر رکھے ہیں، اور باشندگان ہند کو انکی کھوئی ہوئی مدنی آزادیاں (Civil Liberties) واپس دلائینگے۔ مگر واقعات کیا ہیں؟ کیا وہ اکثر و بیشتر قوانین بدستور موجود نہیں ہیں جو انگریزی حکومت نے نافذ کیے تھے؟ کیا خود کانگریسی حکومتیں ان قوانین کو استعمال نہیں کر رہی ہیں؟ اور کیا انہیں استعمال کرنے میں ٹھیک انہی دلائل سے کام نہیں لیا جا رہا ہے جو کسی زمانہ میں انگریزی حکام پیش کیا کرتے تھے؟ وہی کانگریسی جو کہتے تھے کہ بغاوت ہمارا مذہب ہے، مدراس میں مسٹر باٹلی والا پر بغاوت کا مقدمہ چلاتے ہیں اور بمبئی اور سی پی میں مسٹر باپت اور مسٹر جگناتھ پرشاد ورما پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ شولاپور میں "یوم استقلال" کے موقع پر بہت سے آدمیوں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور ایک شخص کو سزائے تازیانہ بھی دی جاتی ہے، حالانکہ اس سزا کے خلاف کسی زمانہ میں شور قیامت برپا کر دیا جاتا تھا۔ سیاسی ایجی ٹیشن کو روکنے کیلیے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ، گولیاں چلانا اور لاٹھی چارج کرنا آج بھی اسی طرح جاری ہے جسطرح پہلے تھا۔ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ، جسکے خلاف کانگریس نے سب سے زیادہ شور مچایا تھا، آج کانگریسی حکومتیں بے تکلف اسکو استعمال کر رہی ہیں۔ احمد آباد میں مزدوروں کا سر کچلنے کیلیے اسے استعمال کیا گیا، اور مدراس

[1] ہریجن۔ مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء۔

میں ہندی کی اشاعت کے خلاف احتجاج کرنے والوں پر آج پوری آزادی کیساتھ اس سے کام لیا جارہا ہے۔ وہی سی آئی ڈی جسکی زیادتیوں پر کسی زمانہ میں ماتم کیا جاتا تھا آج کانگریسی حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف اسکی خدمات سے پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں اور مدراس کا وزیر اعظم صاف کہتا ہے کہ جب ہم نے حکومت کا انتظام ہاتھ میں لیا ہے، (یعنی جب ہم اس حکومت کو توڑنے کیلیے نہیں بلکہ چلانے کیلیے نکلے ہیں) تو سی آئی ڈی سے کام لیے بغیر چارہ نہیں۔ وہی پریس کی آزادی جسکو باشندوں کے مدنی حقوق کی فہرست میں نمایاں جگہ دی جاتی تھی، آج اس کو خود پامال کیا جارہا ہے۔ اخبارات کی ضمانتیں بھی ضبط ہوتی ہیں، نئی ضمانتیں بھی مانگی جاتی ہیں اور ایڈیٹروں پر مقدمے بھی چلائے جاتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حکومت بمبئی نے حال ہی میں پولیس کمشنر کو پورے اختیارات عطا کیے ہیں کہ جس شخص کو چاہے بغیر مقدمہ چلائے شہر بدر کردے۔[1]

اس پورے کارنامہ کا خلاصہ خود ایک صاف گو کانگریسی، مسٹر ایم این رائے کی زبان میں یہ ہے کہ:

"اسمبلیوں میں جانے کا پروگرام اختیار کرنیکے بعد، خصوصاً وزارتیں قبول کرنیکے بعد کانگریسی سیاست تیزی کیساتھ دستوریت (Constitutionalism) کی طرف ترقی معکوس کررہی ہے اور برطانوی امپیریلزم سے لڑنے کی انقلابی ذہنیت کافور ہوگئی ہے"[2]

"کانگریسی وزیروں نے امپیریلسٹ اسٹیٹ کی مشین کو اندر سے توڑنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ جو جنگی مورچے (Strategic Positions) ان کے قابو میں آئے ان کو بھی غنیم پر حملہ

[1] تفصیلات کیلیے ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ کی رپورٹ مندرجہ ٹائمز آف انڈیا یکم نومبر ۳۸ء۔ نیز ٹریبیون کا مقالۂ افتتاحیہ، ۲ اگست ۳۸ء اور اخبار سرونٹ آف انڈیا ۱۴ جولائی ۳۸ء۔

[2] ٹریبیون مورخہ یکم مئی ۳۸ء۔

کرنے کیلیے انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ وہ تو کانگریس ہائی کمانڈ کی اجازت سے بلکہ اسکی ہدایت کے تحت اُسی امپیریلسٹ اسٹیٹ کے انتظام کو چلا رہے ہیں جسے توڑنے کا ارادہ ظاہر کرکے وہ گئے تھے۔

"ایمانداری کا تقاضا ہے کہ اس امر کا صاف صاف اعتراف کر لیا جائے کہ کانگریسی وزارتیں عوام کی معاشی حالت کو درست کرنے کیلیے کچھ بھی نہ کر سکیں اور نہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر وہ آئندہ کچھ کر سکینگی"[1]

اب یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ کانگریس کی "جنگ آزادی" کوئی انقلابی جنگ نہیں ہے، بلکہ جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں، نیم انقلابی نیم دستوری ہے۔ اس کا نقشۂ جنگ یہ نہیں ہے کہ مسلسل لڑ کر انگریزی سلطنت کے نظام کو توڑ ڈالا جائے۔ بلکہ نقشۂ جنگ دراصل یہ ہے کہ اسی نظام سلطنت کے اندر رہ کر حکمراں جماعت پر دباؤ ڈالا جائے اور اس سے بتدریج اختیارات حاصل کر کے اپنا اقتدار جمایا جائے۔ پہلے انہوں نے سول نافرمانی کی تاکہ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کا دائرہ وسیع ہو اور زیادہ سے زیادہ اختیارات مل سکیں۔ اسکے نتیجہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء حاصل ہو گیا۔ اب یہ اس ایکٹ کے مطابق صوبوں کی حکومتیں چلا رہے ہیں اور اپنے پروگرام کے مطابق، جسکی تشریح میں آگے کرونگا، ملک میں اتنا اقتدار حاصل کر لینا چاہتے ہیں کہ دوبارہ آئینی یا نیم انقلابی ذرائع سے برطانوی سلطنت پر دباؤ ڈال کر مرکزی حکومت میں زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کریں چنانچہ آج کل اسی غرض کیلیے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ جواہر لال یورپ کا چکر لگا رہے ہیں۔ گاندھی جی وائسرائے اور نائب وزیر ہند سے ملاقاتیں فرما رہے ہیں، ستیہ مورتی وفاقی دستور کو قبول کرنے کی شرائط پیش کر رہے ہیں، اور سوباش چندر بوس دھمکیوں پر دھمکیاں دیے چلے جاتے ہیں۔ ایک ہی ٹیم ہے جس کا ہر کھلاڑی اپنا اپنا کام خوبی کیساتھ کر رہا ہے، اور سب کی منزل مقصود ایک ہے، یعنی ہندو راج زیر سایۂ برطانیہ۔

[1] نیشنل کال مورخہ ۳۱ جولائی ۳۸ء۔

(۳)

یہاں پہنچ کر ہندو مہاسبھا اور کانگریس دونوں نظری اور عملی حیثیت سے ایک ہو جاتی ہیں گو انکے نام اور کام مصلحتہً جدا جدا ہیں۔

نظری حیثیت سے تو دونوں میں نہ پہلے فرق تھا نہ آج ہے۔ دونوں وطنی قومیت کی علم بردار ہیں۔ دونوں اس ملک میں "فرقوں" (قوموں) کے اختیاری وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ دونوں علحدگی کے ہر رجحان ( ) کی دشمن ہیں حتیٰ کہ کسی معاملہ میں بھی وہ مسلمانوں کے جداگانہ مفاد کا نام تک سننے کی روادار نہیں۔ دونوں کا آخری نصب العین یہ ہے کہ یہاں ایک قومیت پیدا ہو جائے جو تہذیب، تمدن، اخلاق، معاشرت، زبان، ادب، جذبات و حسیات غرض ہر لحاظ سے بالکل یک رنگ ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگریس جہاں "ہندوستانی" کا لفظ بولتی ہے وہاں مہاسبھا "ہندو" کا لفظ استعمال کرتی ہے، مگر معنی دونوں کے ایک ہیں۔

عملی حیثیت سے بظاہر چند سال تک دونوں میں فرق رہا مگر اب اس حیثیت سے بھی کوئی فرق باقی نہیں۔ کانگریس یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اس کا نصب العین کامل آزادی ہے اور وہ انقلابی جدوجہد سے حاصل کریگی۔ بخلاف اسکے ہندو مہاسبھا کہتی ہے کہ انگریزی سلطنت سے آزاد ہو جانے کے بعد "ایک قوم" بنانے کا عمل دشوار بلکہ محال ہو جائیگا۔ یہ عمل صرف اسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کہ انگریزی سلطنت کے زیر سایہ رفتہ رفتہ حکومت کے اختیارات پر قبضہ کرو۔ انگریز اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ یہاں جمہوریت کے اُنہی تصورات کو درآمد کریگا جو اسکے اپنے ملک میں صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ وہ چاہے لڑ کر حکومت کرنے کی پالیسی پر کتنا ہی عمل کرے اور اس غرض کیلئے یہاں مختلف قومیتوں کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی کتنی ہی کوشش کرے، مگر جب کبھی وہ جمہوری ادارات قائم کرنے کا ارادہ کریگا تو اس کا ذہن کوئی ایسی صورت نہ سوچ سکیگا جو اسکے اپنے ملک کے جمہوری ادارات سے اصولاً مختلف ہو۔ لہٰذا اس پر دباؤ ڈال کر جتنی بھی آئینی اصلاحات

ملینگی وہ سب ہندوؤں ہی کو بوجہ انکی عددی اکثریت کے سیاسی قوت و اقتدار کا مالک بنائینگی - اور اس قوت و اقتدار کو اگر ہوشیاری کیساتھ استعمال کیا جائے تو معاشی دباؤ، تعلیمی انقلاب اور حاکمانہ نفوذ و اثر سے رفتہ رفتہ ہندوستان کی مختلف قومیتوں کو "ایک قومیت" میں تحلیل کیا جاسکتا ہے - یہ اور صرف یہی ایک صورت ہے جس سے یہاں "ایک قوم" بنائی جاسکتی ہے، لہذا جب تک یہ عمل پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے "آزادی کامل" کا نام بھی نہ لینا چاہیے - اس سے پہلے انگریزی اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرنا بھارت ورش کیساتھ دشمنی کرنا ہے -

پالیسی کا یہ اختلاف چند سال تک محض ظاہری طور پر کانگریس اور مہاسبھا میں رہا - مگر آج ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کانگریس ٹھیک اسی مقام پر آگئی ہے جہاں ہندو مہاسبھا تھی - اور دونوں مل کر سامراج کے تحت ناظم (Administator) کی خدمات انجام دے رہی ہیں - بہار میں، سی پی میں، یوپی میں اور دوسرے صوبوں میں کھلے ہوئے بدنام مہاسبھائی کانگریس کے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں - سی پی کی سابق کانگریسی وزارت میں ایک صاحب مسٹر دیسمکھ بھی شامل تھے اور یہ وہ صاحب ہیں جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر ہندو مہاسبھا کی طرف سے ایک وفد لیکر لندن پہنچے تھے - سی پی کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر شکلا وہ صاحب ہیں جنہوں نے سوراج پارٹی کے داخلہ کونسل کے زمانہ میں مالوی جی کے زیر قیادت کانگریس سے الگ انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تھی اور جنہوں نے بعد میں کمیونل اوارڈ کے متعلق کانگریس کی پالیسی سے اختلاف کرکے اسکو انتخابات کا نزاعی مسئلہ بنایا - سی پی اسمبلی کا صدر بھی کھلا ہوا مہاسبھائی ہے - کانگریس کیطرف سے اسمبلی کی صدارت کرتا ہے اور مسٹر سادر کر سے مل کر حیدرآباد میں ریاست کے خلاف شورش برپا کرنے کی تدبیریں بھی کرتا ہے - بہار میں بھاگلپور اور دوسرے مقامات پر جو فساد ہوئے ان میں کانگریس کے ذمہ دار کارکنوں نے پورا پورا مہاسبھائی پارٹ ادا کیا - یوپی میں دوری اور ٹانڈہ وغیرہ کے فسادات ان مہاسبھائیوں نے برپا کرائے جو کانگریس کے عہدوں پر فائز تھے - اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "قومیت متحدہ" کی خدمت کرنے والے حضرات

کس آسانی کیساتھ کانگریس سے مہاسبھا میں اور مہاسبھا سے کانگریس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

ان دونوں جماعتوں میں اب اگر کوئی فرق باقی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک ہندو مہاسبھا ہے اور دوسری انڈین نیشنل کانگریس۔ مہاسبھا صریح طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کوئی مسلمان اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ نہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دے سکتی ہے۔ نہ مسلمانوں میں جاکر ماس کانٹیکٹ کرسکتی ہے نہ کسی صوبہ کی حکومت پارٹی سسٹم کی بنیاد پر قائم کرسکتی ہے۔ نہ کہیں خالص ہندو وزارت قائم کرکے یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ یہ "قومی وزارت" ہے۔ نہ مسلمانوں سے یہ کہہ سکتی ہے کہ ہمارے عہدنامہ (Agreement) پر دستخط کرو تب تمہیں وزارت میں شریک کیا جائیگا۔ نہ اسکو مولانا ابوالکلام کی خدمات حاصل ہوسکتی ہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں سے کمزور کیرکٹر کے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں اور اسکے آستانہ پر جھکا دیں نہ اسے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی خدمات میسر آسکتی ہیں کہ وار دھا اسکیم تیار کریں۔ نہ وہ خان عبدالغفار خاں سے کام لے سکتی ہے کہ ۹۰ فیصدی اکثریت رکھنے والے سرحدی صوبہ کو فڈریشن کے قیام سے پہلے ہی اس وحدانی طرز حکومت ( ) کا تابع بنادیں جسکے مرکز پر ہندوؤں کا کامل اقتدار ہو۔ نہ وہ بہت سے علمائے کرام کی خدمات حاصل کرسکتی ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی اقتدار کے نام سے اسکے دائرے میں کھینچ کھینچ کر لائیں اور فتوے دیں کہ اس جماعت میں شریک ہونا واجب کا درجہ رکھتا ہے۔ نہ اسکے لیے یہ دعویٰ کرنا ممکن ہے کہ اسکے لیڈر مسلمانوں کے بھی ویسے ہی نمائندے ہیں جیسے ہندوؤں کے ہیں اور جو کچھ وہ بولتے ہیں "پوری قوم" کی طرف سے بولتے ہیں۔ نہ وہ اسلامی اکثریت رکھنے والے صوبوں میں وزارتوں کی توڑ پھوڑ اس خوبی کیساتھ کرا سکتی ہے کہ وزارت مسلمانوں ہی پر مشتمل رہے مگر اشاروں پر ہائی کمانڈ کے رد و قبض کیا کرے۔ نہ اقلیت ہی کے صوبوں میں اسکو مسلمانوں پر یہ اقتدار حاصل ہوسکتا ہے کہ ان کے منتخب کردہ نمائندوں میں سے جسے چاہے وزارت پر سرفراز کرے اور جس کو چاہے کان پکڑ کر نکال دے۔ یہ سب کام کانگریس ہی سے بن آسکتے ہیں کیونکہ وہ ہندو مہاسبھا نہیں،

انڈین نیشنل کانگریس ہے۔

اس فرق کیساتھ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ جو کام کانگریس کر سکتی ہے وہ مہاسبھا نہیں کر سکتی۔ اور جو کام مہاسبھا کر سکتی ہے وہ کانگریس نہیں کر سکتی۔ کانگریس پیش قدمی کرنیوالی فوج ہے جو آگے بڑھ کر غنیم کے علاقہ پر قبضہ کرتی ہے۔ اور مہاسبھا وہ محافظ دستہ ہے جو عقب میں رہتا ہے تاکہ آگے کی فوج کو حسب ضرورت مدد پہنچاتا رہے۔ کانگریس پر جب کبھی مشترک وطنی جماعت ہونے کی حیثیت سے دباؤ پڑتا ہے، ہندو مہاسبھا فوراً آگے بڑھ کر پشت کو سہارا دیتی ہے، اور مسٹر ساورکر، ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند وغیرہ شور مچانے لگتے ہیں کہ ہندوؤں کے نمائندے ہم ہیں، گاندھی اور جواہر لال نہیں ہیں۔ ایسے نازک مواقع پر اگر عقب میں محفوظ فوج موجود نہ ہو تو مقدمۃ الجیش کو اپنی "قوم پرستی" کا دعویٰ نباہنا مشکل ہو جائے۔ اس فوج کی مدد کام بھی نکال دیتی ہے اور بات بھی بنی رہتی ہے۔

(۴)

ہندو مہاسبھا کیساتھ ساتھ برٹش گورنمنٹ سے بھی کانگریس کا مفاد اسی نقطہ پر متحد ہوتا ہے مسلمانوں میں شخصی اغراض رکھنے والی ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی آپ کو ایسا نہ ملیگا جو برطانوی اقتدار سے کسی قسم کی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں اس قیصریت کا فوری کلی اور قطعی زوال چاہتا ہے۔ برعکس اسکے ہندوؤں کی قومی پالیسی یہ ہے کہ انگریزی حکومت سے اچھی شرائط پر مصالحت کی جائے۔ یعنی ہندو لڑتا ہے نفع پر سودا کرنے کیلیے اور مسلمان لڑتا ہے معاملہ ختم کرنے کیلیے۔ مزید برآں مسلمان انگریزوں کے کسی کام کا نہیں کہ اسکی جیب خالی ہے۔ اور ہندو ایک سرمایہ دار قوم ہے جس کیساتھ تجارتی معاملہ بھی کیا جا سکتا ہے اور آڑے وقت میں مالی مدد بھی اس سے مل سکتی ہے۔ لہذا جسطرح فلسطین میں ایک سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کیلیے مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا مفید تھا اسیطرح ہندوستان میں بھی ایک دوسری سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کیلیے ان کو بھینٹ چڑھا دینا فائدے سے خالی نہیں۔ اسی

بنا پر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان سودا گرانہ معاملہ ہو رہا ہے صوبوں کی حکومت میں تو سودا پٹ چکا ہے، اور اب جو کچھ کھینچ تان ہو رہی ہے صرف مرکزی اقتدار کے معاملہ میں ہے۔ یہ کچھ زیادہ مانگتے ہیں اور وہ کچھ کم پر راضی ہیں۔ اسکے ساتھ ابھی چونکہ معاملہ نیا نیا ہے اسلیے کچھ بدگمانیاں بھی ہیں وہ ابھی پوری طرح اعتماد بھی کرنے کیلیے تیار نہیں ہیں۔ تحفظات کی رسی انہوں نے انکے گلے میں باندھ رکھی ہے۔ جب یہ سلطنت برطانیہ کی محفوظ چراگاہ کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ پوری طاقت کیساتھ رسی کھینچ لیتے ہیں۔ اور جب یہ کھلے میدان میں اقلیتوں کی کھیتی چرنے کیلیے بڑھتے ہیں تو وہ اطمینان کیساتھ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں۔ دستور میں اقلیتوں کی حفاظت کیلیے گورنروں کو جو مخصوص اختیارات دیئے گئے ہیں ان کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ اگر کبھی خدانخواستہ کانگریسیوں نے اس سازش (گاندھی جی کے بقول "شریف آدمیوں کی سی قرارداد" (Gentleman's agreement) سے جو انکے اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان ہو چکی ہے، انحراف کیا اور تاج کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اس تاج کے بجائے اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کا بہانہ کرکے انکی گوشمالی کیجا سکے۔

(۵)

اس ملی بھگت میں برطانیہ کا مفاد پوری طرح محفوظ ہے۔ سول سروس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا یورپین باشندوں کے حقوق سے بھی تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ سرکار کے مالی مفاد کو بھی نہیں چھیڑا جا سکتا۔ مختصر یہ ہے کہ جن جن چیزوں سے انگریزی سلطنت کی اغراض کا تعلق ہے دستور حکومت میں ان سب کی حفاظت اچھی طرح کر لی گئی ہے، اور کانگریسی وزارتیں جو اس دستور کو عملاً قبول کرکے حکومت کا نظم و نسق چلا رہی ہیں ان حدود میں نہ قدم رکھ سکتی ہیں اور نہ قدم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر کسی ایسے پروگرام پر تو عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے جس پر حقیقت میں "جنگ آزادی" کا اطلاق ہو سکے، کیونکہ "جنگ آزادی" کو خواہ آپ کتنا ہی

نیچے گرائیں، بہرحال اسکا منشا یہ تو ہونا چاہیے کہ جہاں باشندگان ہند کا مفاد سرکار برطانیہ کے مفاد سے متصادم ہونا ہو وہاں سرکار کے مفاد کو گرایا جائے اور ہندوستان کی "جنتا" کے مفاد کو ابھارا جائے مگر جس دستور میں سرکار کا مفاد محفوظ ہے اسکی پابندی قبول کرنیکے بعد ایسا کرنا غیر ممکن ہے۔ پھر یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ جنگ آزادی کا دعویٰ لے کر اٹھنے والی جماعت اس دستور کو کس لیے قبول کر رہی ہے اور کیوں اسے چلانے پر مصر ہے؟

اس سوال کی تحقیق اگر آپ واقعات کی روشنی میں کرینگے تو یہ حقیقت آفتاب کیطرح عیاں ہو جائیگی کہ اس وقت کانگریس کے سامنے کوئی پروگرام اسکے سوا نہیں ہے کہ پراونشل آٹانومی سے جو اختیارات بھی حاصل ہو سکیں انہیں لے کر جدید ہندوستانی قومیت کی تخلیق میں استعمال کیا جائے، اور اس ملک کی مختلف قلیل التعداد قوموں میں اپنے امتیازی وجود کو برقرار رکھنے کی جس قدر طاقت باقی ہے اسے حکومت کے زور سے ختم کر دیا جائے۔ نئے دستور کی بنیادی کمزوریوں کے باوجود اس کے پراونشل آٹانومی والے حصہ کو اسی بنا پر قبول کیا گیا ہے کہ اس کا یہی ایک پہلو روشن ہے۔ اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے فڈریشن والے حصہ کو بھی باہزاراں عشوہ و ناز آخر کار اسی روشن پہلو کی خاطر قبول کیا جائیگا تاکہ مسلم اکثریت والے صوبوں کو مرکزی اقتدار کے واسطہ سے قابو میں لایا جائے۔

اس پروگرام کی ایک ایک دفعہ کو میں الگ الگ بیان کرونگا اور تفصیل کیساتھ بتاؤنگا کہ اس پر کس طرح عمل ہو رہا ہے اور اسکے نتائج کیا ہیں۔

(۶)

دستور جدید کے مطابق حکومت کے نظام کو چلانے کیلیے کانگریس نے پارٹی سسٹم اختیار کیا ہے۔ پارٹی سسٹم کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جس مجلس قانون ساز میں کسی پارٹی کی اکثریت ہو وہاں خالصتہً اسی کی حکومت قائم ہو جائے اور وہ دوسری جماعتوں کو من حیث الجماعت، حکومت میں شریک نہ کرے۔ یہ حکمران

جماعت اپنی اکثریت کے زور پر جو قانون چاہے گی بنائیگی، اور جس تجویز یا مسودۂ قانون کو چاہیگی مسترد کردیگی - پھر اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرنا بھی اسی پارٹی کے اختیار میں ہوگا، کیونکہ حکومت کا نظم ونسق کلیتہً اسی وزارت کے ہاتھ میں رہیگا - جو لوگ اس کے اندر داخل ہوں وہ صرف اس صورت سے داخل ہوسکتے ہیں کہ پارٹی کے عہدنامہ پر دستخط کریں اور اُسکے ڈسپلن میں جکڑ دیے جائیں - پھر جب وہ اسطرح پارٹی ڈسپلن کے تابع فرمان ہوجائینگے تو انکے لیے یہ ناممکن ہوگا کہ کسی ایسی تجویز یا مسودۂ قانون کی مخالفت کریں جو پارٹی کی طرف سے پیش ہو، یا خود اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز پیش کریں جسکی اجازت پارٹی نے نہ دی ہو، یا حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کریں - انکو ہر حال میں پارٹی کی فرمانبرداری کرنی ہوگی اور اگر وہ آزادی رائے استعمال کرنا چاہینگے تو انہیں پارٹی سے باہر نکل جانا ہوگا - نیز وہ پارٹی کے اندر رہ کر بھی اسکی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کراسکتے جب تک کہ وہ پارٹی میں اکثریت کو اپنا حامی نہ بنالیں -

حکومت کا یہ سسٹم کانگریس نے ان تمام صوبوں میں اختیار کیا ہے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے - اسکے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عملاً قانون سازی اور تنفیذ قانون دونوں سے بے دخل کردیا گیا ہے - اگر مسلمان کانگریس پارٹی سے الگ رہیں تو وہ اپنی اقلیت کی وجہ سے نہ اپنے مفاد کیلیے کوئی قانون بنواسکتے ہیں، نہ اپنے مفاد کے خلاف کسی قانون کی منظوری کو روک سکتے ہیں، اور نہ قوانین کو نافذ کرنیوالی مشین، یعنی وزارت میں ان کا کوئی پرزہ شریک ہوسکتا ہے - اور اگر وہ اس پارٹی میں شامل ہوجائیں تو انہیں پارٹی ڈسپلن کے طوق وسلاسل پہننے پڑتے ہیں اور اسکے سوا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ باہر رہتے ہوئے زبان کی جو آزادی وہ استعمال کرسکتے تھے وہ بھی چھن جائے - رہا اندر سے پارٹی کی پالیسی پر اثر ڈالنا، تو اقلیت میں ہونے کی وجہ سے یہاں بھی اسکا کوئی موقع نہیں -

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اڑیسہ اور سی پی میں تو علانیہ وہ حکومت کے نظم ونسق سے بے داخل ہیں اور جن صوبوں میں ایک یا دو مسلمان وزیر بنائے گئے ہیں وہاں دراصل مسلمانوں کی جماعت

کو بحیثیت جماعت کے حکومت میں حصہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان کے ایک فرد یا دو افراد کو انفرادی حیثیت سے نوکر رکھا گیا ہے تاکہ محض اس بات کی نمائش کی جا سکے کہ وزارت میں مسلمان بھی شریک ہیں۔

آئینی حیثیت سے دیکھیے تو ان ملازموں کی حیثیت ذمہ دار وزراء کی نہیں ہے۔ کیونکہ ذمہ دار وزیر وہ ہوتا ہے جسکو اپنی جماعت کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، اور انہیں اپنی ذات کے سوا کسی کا اعتماد حاصل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں اُن مسلمان ووٹروں کا اعتماد حاصل ہے جنہوں نے انکو منتخب کیا، مگر کل مسلمان ووٹروں میں انکے ووٹروں کا تناسب شاید پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے اسکے معنی یہ ہوئے کہ وزارت میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اکثریت کی نہیں بلکہ اقلیت کی حکومت ہے، اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، انکی اکثریت حکمراں ہے، کیونکہ ہندو وزیر ہندو ووٹروں کی اکثریت کا اعتماد رکھتے ہیں۔

عملی حیثیت سے دیکھیے تو یہ بالکل بے زور ہیں۔ انکی پشت پر کوئی طاقت نہیں جسکے بل پر یہ کوئی بات زور کیساتھ کہہ سکیں۔ بخلاف اسکے ہندو وزراء کی پشت پر مجلس قانون ساز کی اکثریت کا زور ہے۔ یہ بے چارے بعض صوبوں میں تو کانگریس پارٹی کے اندر بالکل اکیلے ہیں، اور بعض جگہ صرف دو چار مسلمان انکی مدد پر موجود ہیں تو وہ غریب خود پارٹی ڈسپلن میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اسطرح ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان وزراء کی حیثیت ایک نوکر سے زیادہ نہیں ہے، اور اس حیثیت کا کھلا ہوا مظاہرہ سی پی کے سابق مسلمان وزیر مسٹر شریف کے معاملہ میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے جب ایک مسلمان قیدی کو اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کیا، درانحالیکہ باقاعدہ تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ انہوں نے نہ تو اس معاملہ میں مذہبی عصبیت سے کام لیا، نہ کسی قسم کی بددیانتی کی اور نہ جائز قانونی حدود سے تجاوز کیا[1]۔ اس کے برعکس ابھی حال میں مسٹر شریف کے جانشین ہندو وزیر نے اسی قسم

[1] ملاحظہ ہو مدینہ مورخہ ۲۵ جون ۳۸ء۔

کے ایک مجرم کو جسے ہائی کورٹ سے سزا ہو چکی تھی، اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کر دیا اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہوئی۔ مسٹر شکلا نے وزارت کا قلمدان سنبھالتے ہی فسادات جبل پور کے ملزموں کو، جنہیں سشن سپرد کیا جا چکا تھا، بلا کسی قانونی وجہ کے رہا کر دیا اور اس پر بھی کسی تحقیقات کی ضرورت نہ سمجھی گئی[1]۔ پنڈت شکلا سے پہلے ڈاکٹر کھرے کی وزارت پر خود کانگریسیوں نے رشوت، خیانت، غبن، اور اپنے متعلقین کو ملازمتوں میں بھرنے کے سخت الزامات عائد کیے تھے، مگر ان کے معاملہ کو گاندھی جی نے یہ کہکر رفع دفع کر دیا تھا کہ:

"کانگریس بہرحال معمولی انسانوں پر مشتمل ہے اور وہ خوبیوں اور برائیوں دونوں اس قوم کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں جسکی وہ نمائندگی کر رہے ہیں[2]"

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر کھرے کیساتھ بعد میں بہت سخت معاملہ کیا گیا، مگر کس وقت؟ جبکہ انہوں نے کھلم کھلا خدایان کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ مسٹر شریف کیطرح اگر وہ گھٹنے ٹیک کر ناک رگڑتے تو انہیں کبھی وزارت سے نہ نکالا جاتا۔

(۷)

پارٹی گورنمنٹ اور پارٹی ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ جداگانہ انتخاب ہے کیونکہ اسکی بدولت مسلمانوں کی آواز نمایاں طور پر بلند ہو سکتی ہے اور اگر مسلمان نمائندوں کی بڑی اکثریت کانگریس پارٹی سے الگ رہے تو پارٹی گورنمنٹ قائم کرنے کی صورت میں کانگریس کی مہاسبھائیت بالکل بے پردہ ہونے لگتی ہے۔

مخلوط انتخاب کا مطالبہ اسی بدنمائی کو دور کرنے کیلیے بار بار پیش کیا جاتا تھا۔ مگر انگریز ابھی

[1] ملاحظہ ہو مدینہ مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء

[2] ٹریبیون مورخہ ۱۹ جون ۳۸ء

اس شریف آدمیوں کی سی قرار داد" پر پوری طرح اعتماد کرنے کیلیے تیار نہ تھا جو اسکے اور کانگریس کے درمیان زیر تجویز تھی، اسلیے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ اپنے مفاد کی خاطر اس نے جداگانہ انتخاب کو برقرار رکھا۔

اس میں ناکام ہونیکے بعد دوسری تدبیر یہ نکالی گئی کہ جداگانہ انتخاب میں اندر سے نقب لگائی جائے، یعنی کانگریس براہ راست مسلمان حلقہ ہائے انتخاب میں جاکر مسلمان ووٹروں کو ہموار کرے اور ایسے مسلمانوں کو خود مسلمان رائے دہندگان ہی سے منتخب کرالائے جو پارٹی ڈسپلن اور ڈکٹیٹرشپ کو بخوشی قبول کرنے والے ہوں، اپنے صوبہ کی کانگریس پارٹی کے اور پھر اس کے اوپر ہائی کمانڈ کے غلام بنکر رہیں، جس طرح یہ آقا انہیں بٹھائیں اس طرح بیٹھیں اور جس طرح اٹھائیں اس طرح اٹھ جائیں، جس قسم کے قوانین ہندو اکثریت پاس کرنا چاہے انہیں مسلمانوں کیطرف سے بے چون وچرا منظور کریں، اور مسلمانوں کی قومیت کو فنا کرنے کیلیے جو تدبیریں کوئی مہاتما یا کوئی پنڈت سوچے ان کو مسلمانوں میں نافذ کرنے کی زحمت خود مہاتما جی یا پنڈت صاحب کو نہ اٹھانی پڑے بلکہ اس خدمت کو کوئی خاں صاحب یا کوئی سید صاحب انجام دیں۔ اس کا نہایت پاکیزہ نام مسلم ماس کانٹیکٹ رکھا گیا ہے۔

اگر یہ چیز کامیاب ہوجائے اور مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب اس حد تک کانگریس پارٹی کے زیر اثر آجائیں کہ وہ اپنے مطلب کے جس مسلمان کو چاہے ان سے منتخب کرا سکے، اور جو مسلمان اسکے مقابلہ پر کھڑا ہو وہ ناکام ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کبھی کسی موقع پر مسلمانوں کے مفاد کی شدید پامالی دیکھ کر کانگریس پارٹی کے کسی مسلمان رکن کو غیرت بھی آگئی اور وہ رکنیت سے مستعفی بھی ہوگیا تو کانگریس پارٹی خود اس کے حلقۂ انتخاب میں اسکو شکست دیگی اور اس سے کم تر غیرت رکھنے والے کسی مسلمان کو مسلمان ووٹروں سے منتخب کرالائیگی تاکہ وہ اس سے زیادہ بے پروائی کے ساتھ اپنی قوم کے مفاد کو پامال کرائے۔ ماس کانٹیکٹ اس انتہائی نتیجہ تک پہنچ کر رہیگا اگر اس کی تائید میں ہمارے علمائے کرام چند سال اور اسی سرگرمی کیساتھ کوشش کرتے رہے، پھر جب تیر ہاتھ سے نکل چکیگا تو اسکو واپس لانے کیلیے بخاری شریف کا ختم پڑھا جائیگا۔

(۸)

اسکے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ سو انکے لیے اجتماعی ماہی گیر (MASS CONTACT) اور انفرادی صید افگنی (INDIVIDUAL CONTACT) دونوں سے آج کل کام لیا جا رہا ہے۔

مسلمان دس پندرہ برس سے جس خواب غفلت میں مبتلا تھے اسکے بدترین نتائج آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ جدید آئین کے نافذ ہوتے پر جب اسمبلیوں کیلیے انتخابات ہوئے تو یہاں کوئی ایسی منظم پارٹی نہ تھی جو قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر کام کرتی اور مسلمان رائے دہندوں کو صحیح سیاسی تعلیم دے کر ایسے نمائندے منتخب کراتی جو بے غرض، مخلص، اور ایک مرکزی نظام کے مطیع ہوتے۔ جگہ جگہ مختلف جماعتوں نے محض شخصی اغراض اور طائفہ بندی کی بنیاد پر الکشن لڑائے۔ جس شخص کو کسی قسم کا اثر حاصل تھا وہ ایک پارٹی بنا کر کھڑا ہو گیا، اور دوسری پارٹی کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوا۔ قومی پروگرام اور قومی پالیسی نہ اُسکے پاس نہ اُسکے پاس۔ ہر ایک کے سامنے وزارتیں، مناصب اور عزت و جاہ اسطرح یہ لوگ اسمبلیوں میں پہنچے، اور انکی بدولت مسلمانوں کی اکثریت ایک بندھے ہوئے جتھے کا رول رکھنے کے بجائے بہت سی ٹکڑیوں میں بٹ کر بے زور ہو گئی۔ ان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد میں انڈی پنڈنٹ ارکان بھی منتخب ہو کر پہنچے۔ انڈی پنڈنٹ کے معنی عام فہم زبان میں مرغ بادنما کے ہیں۔ یہ کوئی قومی مقصد یا قومی پروگرام لے کر نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ شخصی حیثیت سے قسمت آزمائی کرے اور جدھر کامیابی کا موقع دیکھے اُدھر چلا جائے۔ عام مسلمان ووٹر ایسے جاہل کندۂ ناتراش تھے کہ انہوں نے نہ ان مرغان بادنما سے پوچھا اور نہ اُن جتھے بند لیڈروں سے کہ آپ حضرات کے پاس پروگرام کیا ہے؟ آپ کس پلے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ آپ کس کیرکٹر کے لوگ ہیں؟

آپ نے پہلے ہماری قوم کیلیے کیا کیا اور اب کیا کرنیکا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہاں کسی کے ذہن میں یہ تھا ہی نہیں کہ اسمبلی کیا بلا ہوتی ہے، جدید دستور کیا ہے، اور ان اسمبلیوں میں جو کچھ ہوگا اسکے کیا اثرات ہماری زندگی پر پڑینگے۔ یہاں تو دیکھنے والوں نے بس یہ دیکھا کہ اسمبلی کی کرسی عزت کی کرسی ہے تو کیوں نہ ہمارے قبیلہ کا آدمی اس کرسی پر پہنچے؟ چاہے وہ خرِ ناشخص ہی کیوں نہ ہو۔ غرض اس قومی حماقت کا، جو نہایت وسیع پیمانہ پر ملک کے کئی صوبوں میں کی گئی، یہ انجام ہوا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں کوئی منظم جماعت ایسی پیدا ہی نہ ہوسکی جو ہندو اکثریت کے صوبوں کی طرح مضبوط ہاتھوں سے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کرتی اور ایک بنیانِ مرصوص بنکر جم جاتی۔

ادھر کانگریس جب ہندو اکثریت کے صوبوں میں ٹھوس بنیاد پر وزارتیں قائم کر چکی تو اس نے مسلم اکثریت والے صوبوں کیطرف دیکھا اور انکی کمزوری کو بھانپ لیا۔ انکے لیے اس نے جو پروگرام مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ان صوبوں میں جو پارٹیاں برسرپیکار ہیں ان کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے، ان کے افراد کی نفسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جائے، ان میں جو ضعیف ترین کیرکٹر کے لوگ ہوں انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چھانٹ چھانٹ کر آلۂ کار بنایا جائے، اور اس طرح مسلمانوں کی جمعیت میں سے جتنے آدمی توڑے جاسکیں انہیں کانگریسی اقلیت کے چھوٹے مگر منظم بلاک کیساتھ ملا کر ایسی وزارتیں قائم کرادی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوں، یا اگر اس میں کامیابی نہ ہوسکے تو کم از کم وہاں وزارت کو اس قدر کمزور اور اس قدر بے اثر بنا دیا جائے کہ وہ ادھ موئی ہو کر رہ جائے۔ ماتم کا مقام ہے کہ کانگریس کیطرف سے اس جلیل القدر خدمت کا بیڑا ہماری ہی قوم کے ایک شخص نے اٹھایا، اور اس سے بھی بڑھ کر ماتم کا کا مقام یہ ہے کہ یہ شخص وہ تھا جس سے ہم شیخ احمد مجدد سرہندی اور شاہ اسماعیل شہید کی جانشینی کی متوقع تھے، جو کبھی اسلامی نظام جماعت کا سب سے بڑا داعی تھا، جس نے برسوں مسلمانوں کو وحدت و مرکزیت کی دعوت دی، جسکی زبان سے ہم کبھی ایاکم والتفرقہ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم

اللہ مذہب[1] پرورس ہو عظمت منا کرتے تھے، جو کسی زمانہ میں ہم کو تلقین کیا کرتا تھا کہ "وہ جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے" مسلمانوں کی بدقسمتی کہ بالآخر وہی امت کے پراگندہ سروں سے جو سر کھیلنے نکلا اس نے تمام ہندوستان کو اپنی قوم کی ذلت کا یہ تماشا دکھلایا کہ اس قوم کے چیدہ اور سربرآوردہ لوگ بھی کتنے ذلیل، کتنے بودے کیرکٹر کے لوگ ہیں، کس آسانی کے ساتھ انکو آپس میں لڑایا جاسکتا ہے اور کس بے شرمی کیساتھ یہ لیگ وزارت کے پیچھے اس پارٹی سے اُس پارٹی میں اور اُس سے اس میں منتقل ہوجاتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو شدتِ الم سے بے اختیارانہ قلم سے نکل گیا۔ میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ اس وقت مسلم اکثریت کے صوبوں میں کانگریس کی پالیسی کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں بھی انکو خود مختارانہ حکومت نہ کرنے دی جائے بلکہ انکے منافقات سے فائدہ اٹھا کر یا اس کی ٹکٹ کے ذریعہ سے انکے بڑے حصہ کو شدھ کرکے وہاں ایسی وزارتیں قائم کرائی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوں۔ اگر اس مقصد میں کانگریس کامیاب ہوگئی (اور کیوں نہ ہوگی جبکہ آج ہماری قوم اٹھارویں صدی سے بھی زیادہ فیاضی کیساتھ اپنے قاتل خود مہیا کر رہی ہے) تو یوں سمجھئے کہ یہ فیڈریشن سے بھی پہلے ایک ایسے فیڈریشن کا قیام ہوگا جس میں مرکزی اقتدار تمام تر ہندو اکثریت کے ہاتھ میں رہیگا۔ اور یہ مرکز برطانوی حکومت کے تجویز کردہ وفاقی مرکز سے بدرجہا زیادہ سخت و ہمہ گیر ہوگا۔ اس میں بات بات پر وزراء کے کان کھینچے جائینگے، ذرا ذرا سے قصور پر انکو پکڑ بلایا جائیگا، ان پر تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیئے جائینگے، اور اگر انہوں نے کچھ مقابلہ کی ہمت کی تو لات مار کر انکو ایوان وزارت سے باہر کر دیا جائیگا۔ جب وزارتیں مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں اسدرجہ بے بس ہوں، اور پھر اقتدار ہندو اکثریت کے ہاتھ میں ہو، تو اسکے معنی یہ ہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں پرآونشل اٹانومی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی اور ہندو اس جگہ بھی مسلمانوں پر حکمراں ہوگئے جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔

[1] اثر سیدنا علی رضی اللہ عنہ: "متفرق ہو کر بچھڑا ہوا آدمی شیطان کا حصہ ہے جس طرح بچھڑی ہوئی بکری بھیڑیئے کا حصہ ہوتی ہے"

صوبۂ سرحد کی مثال اس نتیجہ کی توضیح کیلیے بالکل کافی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جہاں ۹۵ فیصدی مسلم اکثریت ہے وہاں بھی حکومت کی پالیسی اور وزارت کی گردن کانگریس ہائی کمانڈ کے ہاتھ میں ہے۔ وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کو سمجھنے اور سرحدی پٹھانوں میں نافذ کرنے کیلیے پشاور سے ماہرین تعلیم دہلی اور وردھا بھیجے جاتے ہیں۔[1] سرحد کا وزیر اعظم ہندوؤں کو خوش کرنیکے لیے وعدہ کرتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کی ریڈریں مسلمان بچوں کو بھی نہ پڑھائی جائینگی، اور ایک ہندو کے معاوضہ میں قبائل کے دس مسلمانوں کو پکڑا جائیگا۔ اس نیازمندی پر بھی یہ حال ہے کہ وزیر اعظم صاحب اگر ایک مسلمان ملزم کو الزام سے بری پاکر ملازمت پر بحال کر دیتے ہیں تو ہندو مہاسبھا انکے خلاف شور محشر برپا کر دیتی ہے اور کانگریس ہائی کمانڈ اسکی باز پرس کیلیے وزیر صاحب کو بمبئی کھینچ بلاتی ہے۔ اسکے بعد بھی جو شخص نہ دیکھ سکے کہ یہ سڑک سیدھی ہندو راج کو جا رہی ہے، اسکے حق میں بس یہی دعا کرنی چاہیے کہ خدا اُسے آنکھیں دے۔

یہ تمام تفصیلات جو نمبر ۶، ۷ اور ۸ میں بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنیسے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید دستوری اصلاحات سے فائدہ اٹھانیکا جو طریقہ کانگریس نے اختیار کیا ہے اسکا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس دستور کی بدولت جسقدر سیاسی طاقت برطانوی قیصریت سے ہندوستان کی طرف منتقل ہو وہ کلی طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں آجائے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں تو وہ براہ راست ہندو اکثریت کے محکوم ہونگے۔ اور جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں انکی حکومت کو کانگریس ہائی کمانڈ کا مطیع بنالیا جائیگا۔ اور اسکے ساتھ ساتھ ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ کوشش برابر جاری رکھی جائے گی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا علیحدہ سیاسی وجود ختم ہو جائے، نہ انکی اپنی کوئی علحدہ سیاسی پالیسی رہے اور نہ مستقل سیاسی قیادت بلکہ وہ اس بڑے سیاسی مجموعہ (BODY POLITIC) میں گم ہو کر رہ جائیں جس میں اصول جمہوریت کی بنا پر ہندو عنصر ... کی حیثیت بہرحال غالب اور فیصلہ کن رہیگی۔ اس مجموعہ میں گم ہو جانیکے بعد جو مجموعہ کے لیڈر ہونگے وہی مسلمانوں کے بھی لیڈر ہونگے اور ظاہر ہے کہ اکثریت کی طاقت ہندوؤں ہی کو لیڈر بنائیگی۔ اسی طرح مسلمانوں کی سیاسی پالیسی بھی...

[1] نیشنل کال مورخہ ۱۰ جون ۳۸ء و ٹریبیون مورخہ ۲۲ جولائی ۳۸ء

وہی ہوگی جو مجموعہ کی ہوگی، اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں سرشماری پر ہر بات کا فیصلہ ہو وہاں ہر پالیسی کا ہندو پالیسی ہونا لازم ہے۔

ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقار کو ہندو لیڈر جس راستہ پر لیجانا اور جس منزل تک پہنچانا چاہتے ہیں اسکا پہلا اور ضروری مرحلہ یہی تھا۔ اگر اس مرحلہ پر وہ سیاسی ارتقار کا رخ اپنی منزل کیطرف پھیرنے میں کامیاب ہوجائیں تو پھر لازماً آئندہ جو قدم بھی اٹھیگا اسی منزل کیطرف اٹھیگا، کیونکہ اس مرحلہ پر انکی کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ گھوڑے کی باگیں پوری طرح انکے ہاتھ میں آجائیں۔ اسی لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ء کو نامنظور کرنیکا بار بار اعلان کرنے پر بھی انہوں نے اسے منظور کرلیا۔

اب ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی بار بار پلٹ کر ہم سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ اس ڈیڑھ سال کی حکومت میں کانگریسی وزارتوں نے کہاں اور کیا مسلمانوں پر ظلم کیا؟ ایک صاحب نے تو اخبارات میں یہ چیلنج بھی چھپوایا تھا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ بالفرض انہوں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ مان لیجیے کہ بڑی ہی اچھی طرح حکومت کی۔ مگر یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اپنی باگیں بالکل دوسروں کے ہاتھ میں دیدی جائیں؟ سوال ان اشخاص کا نہیں ہے جو آج برسر اقتدار ہیں بلکہ سوال ادارہ کی نوعیت کا ہے۔ جس ادارہ کی نوعیت یہ ہو کہ ایک قوم دوسری قوم پر حکمراں بنجائے، اور ایک قوم دوسری قوم کے قبضۂ تصرف و اختیار میں چلی جائے، ظلم ایسے ادارہ کی عین فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ آج بالقوہ ہے تو کل بالفعل ہوگا اور بالفعل ہوئے بغیر نہ رہیگا

(۹)

مختلف قوموں اور تہذیبوں کے ملک میں اگر سیاسی اقتدار کسی ایک قوم کے ہاتھ میں مرتکز ہوجائے اور پھر وہ تمام ملک کیلیے ایک قومیت اور ایک تہذیب و تمدن کی تشکیل کرنا چاہے تو یہ فطری اور لازمی بات ہے، کہ اس قومیت اور اس تہذیب و تمدن کی شکل اسی برسر اقتدار قوم کے منشا کے مطابق ہوگی۔ دوسری قوموں کی تہذیب اور . . .

. . . قومیت کا رنگ اس میں پھیکا ہوگا اور پھیکا ہوتا چلا جائیگا یہاں تک کہ بالکل تحلیل ہو جائیگا۔ نامساوی آمیزش میں انصاف ممکن ہی نہیں، خواہ کتنی ہی نیک نیتی کیساتھ انصاف کی کوشش کیجائے

کانگریس نے اقتدار حاصل کرنیکے بعد مستقبل کے ہندوستان کی تشکیل جس ڈھنگ پر شروع کی ہے اس کو آنکھیں کھول کر دیکھیے تو آپکو خود نظر آجائیگا کہ اس نقشہ میں مسلمانوں کی قومیت اور تہذیب کیلیے کوئی جگہ نہیں۔

سب سے پہلے وردھا اسکیم کو لیجیے[1]۔ یہ اسکیم مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بنائی گئی ہے[2]۔ اسکی خصوصیت یہ ہے کہ اس اسکیم کے مطابق عام باشندگان ہند کے بچوں کو سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لازمی جبری تعلیم دی جائیگی[3]۔ لازمی اور جبری تعلیم کا مفہوم خوب ذہن نشین کر لیجیے۔ جس علاقے میں حکومت کے زور سے یہ اسکیم نافذ ہوگی وہاں کا کوئی باشندہ نہ تو اپنی اولاد کو اس نظام تعلیمی میں شریک ہونے سے روک سکیگا اور نہ کوئی دوسرا نظام تعلیمی ایسا موجود ہوگا جس میں وہ انہیں داخل کر سکے۔ آدمی کا کیرکٹر جس عمر میں بنتا ہے یا یوں کہیے کہ جس عمر میں اسکی آدمیت کی تشکیل ہوتی ہے وہ بیشتر بلکہ تمام تر اس اسکیم کے قبض و تصرف میں آجاتی ہے۔ انگریزوں کا بنایا ہوا نظام تعلیم لازمی و جبری نہ تھا۔ اس میں جبر کا عنصر صرف اس حیثیت سے تھا کہ جو اسکے دائرے سے باہر رہیگا وہ مادی کامیابی کے مواقع سے محروم رہیگا۔ تاہم اس میں آدمی کیلیے یہ اختیار باقی تھا کہ اگر اس محرومی کو قبول کرلے تو اس نظام تعلیمی سے آزاد رہ کر جس نظام کو پسند کرے اس میں شریک ہوجائے لیکن وردھا اسکیم میں سرے سے یہ اختیار باقی نہیں رہتا۔ یہاں آدمی مجبور ہے کہ اپنی آئندہ نسل کو اسی نوعیت کا آدمی بنانے کیلیے سپرد کردے جس نوعیت کے آدمی یہ اسکیم بنانا چاہتی ہے۔

اچھا اب دیکھیے کہ یہ اسکیم کس نوعیت کے آدمی بنانا چاہتی ہے؟ وہ بنیادی تصورات جن پر یہ پوری اسکیم تیار کی گئی ہے، حسب ذیل ہیں:

(۱) ہندوستان کی پوری آبادی کو "ایک قوم" فرض کیا گیا ہے۔ اسکیم میں جگہ جگہ ہمکو اس قسم

---

[1] میرے پیش نظر وہ اردو رپورٹ بھی ہے جو رسالہ جامعہ مورخہ جنوری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہے اور وہ انگریزی پمفلٹ بھی ہے جو (BASIC NATIONAL EDUCATION) کے نام سے ہندوستانی تعلیمی سنگھ نے شائع کیا ہے۔ مگر میں زیادہ تر اردو رپورٹ ہی کا حوالہ دونگا۔

[2] جامعہ صفحہ ۱۱۱ [3] جامعہ صفحہ ۱۳۱

کے فقرے ملتے ہیں :

"(مہاتما گاندھی نے) اس کا بیڑا اٹھایا ہے کہ تعلیم کی ایک ایسی راہ نکالینگے جو ہندوستانی کی طبیعت کے مناسب ہو اور جس سے ساری قوم کی تعلیم کا کام کم سے کم وقت میں چل نکلے" (صفحہ ۱۱۱)

"اسے تعلیم کی اچھی پالیسی اور قوم کی ترقی کی ضروری تدبیر سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے" (صفحہ ۱۱۴)

"اور قوم کے بچوں کو اس تعلیمی اسکیم کا مقصد اور اسکی قیمت سمجھا سکے" (صفحہ ۱۲۸)

اسکیم کا نام ہی "بنیادی قومی تعلیم" کی اسکیم ہے - اسکے معنی یہ ہیں کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد ہی قومیتوں کی نفی پر رکھی گئی ہے - اس میں کسی کی جداگانہ قومیت کا رنگ نہیں آسکتا - یہ بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ ہماری آئندہ نسل کے ذہن سے اس تخیل کو نکال دے کہ "ہندوستانی" کے سوا انکی کوئی اور قومیت بھی ہے -

(۲) شدھ ہندوستانی بن جانیکے بعد سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت جس سے بچہ کو متصف ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ ایک اچھا کاروباری آدمی ہو - ہر علم اسکو اسلیے سکھایا جائے، اور وہ اسی لیے اسکو سیکھے کہ روٹی پیدا کرنے میں اس سے مدد ملے - اسکیم کے واضعین کی نگاہ میں آدمیت اور کمانے کی قابلیت، دونوں مترادف المعنی الفاظ ہیں - پوری اسکیم پر تعلیم کا مادّی نقطۂ نظر اس قدر غالب ہے کہ اسکے زیر اثر جو نسل پرورش پائیگی وہ مادّہ پرست بنکر اٹھے گی اور خوردن برائے زیستن کے بجائے زیستن برائے خوردن کی معتقد ہو گی - ایک طرف تعلیم دینے والی حکومت رعایا کے بچوں کی تعلیم کا انتظام اس ذہنیت کے ساتھ کریگی کہ اس پر تعلیمی مصارف کا کم سے کم بار پڑے اور بچے کسی ایسی دستکاری کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کریں جسکی آمدنی سے استادوں کی تنخواہیں اور مدرسے کا خرچ نکل آئے[1] - دوسری طرف پورا نظام تعلیم بچے میں یہ ذہنیت پیدا کریگا کہ کما کھانا اسکی زندگی کا اولین بلکہ شاید ایک ہی مقصد ہے - تعلیم کا مرکز و محور کسی نہ کسی بنیادی دستکاری مثلاً زراعت یا نوربافی یا لکڑی یا دھات

[1] صفحہ ۱۱۲

کے کام کو رکھا گیا ہے اور پورے تعلیمی کورس کو اسی محور کے گرد گھما دیا گیا ہے۔ اس میں دو بنیادی مقصد واضعین کے پیش نظر ہیں۔ ایک یہ کہ:

"ہر سمجھدار شہری کو سماج کا کام کرنے والا رکن ہونا چاہیے" (ص ۱۱۴)

"یہ اسکیم اسلیے بنائی گئی ہے کہ ملک میں کام کرنیوالے پیدا ہوں جو ہر مفید کام کو چاہے وہ میلا اٹھانے ہی کا کام ہو عزت کے قابل سمجھیں، جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہوں" (ص ۱۱۴)

"ہمارا مقصد عالم فاضل پیدا کرنا نہیں بلکہ ہوشیار سمجھدار پڑھے لکھے دستکار پیدا کرنا ہے جو صحیح خیالات اور سماج کی خدمت کا شوق رکھتے ہوں" (ص ۱۲۸)

دوسرا مقصد یہ ہے کہ:

"مہاتما جی نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ حکومت کو اسکا ذمہ لینا چاہیے کہ اپنے ہونے والے شہریوں کے کام کی پیداوار کو اس بھاؤ (بازار کے بھاؤ) پر خرید لے گی..... ہم اس رائے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ اس آمدنی سے جو مالی فائدہ ہوگا اسے چھوڑ کر یوں بھی ہمارا خیال ہے کہ سکھانیوالوں اور سیکھنے والوں کے کام کی اچھائی کو جانچنے اور ناپنے کا کوئی پیمانہ ہونا چاہیے" (ص ۱۱۵)

یعنی تعلیم کی کامیابی کو جانچنے اور ناپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ طلبہ نے کتنا کمایا اور استادوں نے انکو کتنا کمانیکے قابل بنایا۔ اسی مادّی نقطۂ نظر کی بنا پر ساڑھے پانچ گھنٹہ کے اوقات تعلیمی میں سے ۳ گھنٹہ ۲۰ منٹ دستکاری کے لیے وقف کیے گئے ہیں اور باقی اوقات میں جو دوسرے علوم پڑھائے جائینگے ان میں بھی بنیادی مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ وہ کاروباری زندگی میں مددگار ہوں۔ اس پوری اسکیم پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسکے پیش نظر ایک صنعتی سماج (INDUSTRIAL SOCIETY) پیدا کرنا ہے جس کے افراد زیادہ تر مادّی قدروں ہی سے واقف ہوں، مادّی پیمانے ہی سے

زندگی کی ہر چیز کو ناپیں، اور بلند تر اخلاقی و روحانی چیزوں کی قدر کرنیکا ذوق ہی ان میں پرورش نہ پاسکے ایسی سماج کے ماحول میں ہر روحانی تہذیب خود ٹھٹھر کر رہ جائیگی۔[1]

(۳) اس مادہ پرست سوسائیٹی میں "شہریت" (CITIZENSHIP) کا جو مطمح نظر (IDEAL) اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

"یہ ہونیوالی بات ہے کہ نئے ہندوستان کی سماجی زندگی، سیاست، معیشت اور تہذیب میں جمہوریت کا رنگ دن پر دن بڑھتا جائیگا" (ص ۱۱۳)

جمہوریت کے رنگ کا مفہوم شائد عام لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے اپنی معاشرت اور تہذیب میں آئندہ یک رنگ ہوتے چلے جائینگے۔ یہ دراصل اسکیم کے واضعین کا نصب العین ہے جسکو انہوں نے شدت یقین کی بنا پر پیشین گوئی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر وہ آئندہ نسل کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس سے:

"بچے کو عام طور پر انسانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے لوگوں کی ترقی سے دلچسپی ہو جائے"

"اسکے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت کرے اور آنیوالے زمانے کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ایک ایسی سماج کا گھر ہوگا جسکی نیو مل کر کام کرنے اور محبت سچائی اور نیاؤ پر رکھی جائیگی"

"سب کے دل میں ایک دوسرے کے مذہب کی اور دنیا کے سب مذہبوں کی عزت پیدا ہو جائے"

[1] کوئی شخص ہماری اس تنقید سے یہ نہ سمجھے کہ ہم کسب رزق کو غیر اہم اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اسکی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں۔ مگر ہمارے اور دردھا اسکیم کے نقطۂ نظر میں وہی فرق ہے جو خوردن برائے زیستن اور زیستن برائے خوردن میں ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ روٹی مقصود بالذات ہو اور دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصد حیات اس سے بلند تر ہو اور روٹی اس مقصد کی خاطر زندہ رہنے کیلیے ہو۔ پہلا نقطۂ نظر اگر کسی سوسائیٹی پر چھا جائے تو اسلام اس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

..... دنیا کے مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں۔"

"قومی تہواروں اور قومی ہفتے کا منانا ہر اسکول کی زندگی میں ایک خاص چیز ہونا چاہیے" (صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

ان سب بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکیم بنانے والوں کے پیشِ نظر مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ملا کر ایک سماج یعنی ایک ہیئت اجتماعی یا ایک سوسائٹی بنانا ہے۔ اسلیے وہ ہر مذہب کی ایسی تعلیمات کو بچوں کے ذہن سے خارج رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو ان میں مذہبی انفرادیت پیدا کرتی ہوں۔ تمام مذاہب کے متعلق یہ نظریہ انکے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں۔ وطن پرستی ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مذہبیت کی بنیاد پر الگ الگ رہنے کے بجائے وطنیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں۔ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت انکے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سب میں قومی افتخار کے جذبات ایک ہی سرچشمے یعنی ہندوستان کے زمانۂ ماضی سے پیدا ہوں اور بیرون ہند کی تاریخ سے انکے جذبات کا تعلق منقطع ہو جائے۔

وطنی قومیت بنانے کے لیے یہ چار عنصر ضروری ہیں، اور ہر وہ تعلیمی اسکیم جسکا بنیادی مقصد وطنی قومیت بنانا ہو اس پر مجبور ہے کہ مذاہب کے ایسے علم کو آئندہ نسل کے دل و دماغ سے دور رکھے جو ان کے فروق اور اختلافات کو نمایاں کرنیوالا ہو۔ اگر وہ شرک اور توحید، خدا پرستی اور بت پرستی، پیغمبر اور اوتار، عقیدۂ آخرت اور عقیدۂ تناسخ کے فرق کو بچوں کے ذہن میں اُتر جانے دیگی تو اپنے عین مقصد کو نقصان پہنچائیگی۔ اسکے لیے تو ناگزیر ہے کہ بچوں کے مذہبی علم کو صرف اس قسم کی باتوں تک محدود رکھے کہ دیکھو جھوٹ بولنا سب مذہبوں میں گناہ ہے، چوری سب میں حرام ہے، زنا کو سب منع کرتے ہیں، وغیر ذالک۔ اسی طرح وہ اس پر بھی مجبور ہے کہ جن قوموں کو افتخار کے جذبات بیرون ہند کی تاریخ سے ملتے ہیں ان کے اس سرچشمے کو بند کرے اور پرا چین سمے کے ہندوستان سے ان کا تعلق جوڑے۔ اگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عمر اور علی اور

خالد رضی اللہ عنہم سے وابستگی کو یونہی قائم رہنے دیگی تو اپنے اساسی مقصد پر خود ضرب لگائیگی۔ اس چیز کو مہاتما گاندھی نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے:

"ہم نے وردھا کی تعلیمی اسکیم سے مذاہب کی تعلیم کو باہر رکھا ہے اسلیے کہ آج مذاہب جس طرح پڑھائے جاتے ہیں اور جسطرح ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ وحدت پیدا کرنیکے بجائے اختلاف پیدا کرنیکا موجب ہے۔ مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ جو سچائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں وہ سکھائی جاسکتی ہیں اور سکھائی جانی چاہئیں[1]"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کی تعلیم دینا اُس پالیسی اور اُس مقصد ہی کے خلاف ہے جسکے لیے یہ ساری اسکیم بنائی گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ "وردھا اسکیم میں یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ مذہبی تعلیم نہ ہونی چاہیے۔ اس وقت جو طریقہ جاری ہے، ہم نے اُسی کو برقرار رکھا ہے، یعنی مدرسہ کے اوقات کے ماسوا جو گروہ چاہے اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرے[2]" لیکن مہاتما گاندھی کا بیان اور خود ڈاکٹر ذاکر حسین کی اپنی اسکیم اُنکے اس قول کی تکذیب کیلیے کافی ہے۔ جس قسم کی شہریت پیدا کرنے کو انہوں نے اپنی تعلیمی اسکیم کا مقصود ٹھیرایا ہے، اسکو یہ چیز بھی نقصان پہنچائیگی کہ مسلمان یا دوسرے مذاہب کے پیرو اپنے بچوں کو مذہبی عقائد کی تعلیم خارج از اوقات مدرسہ دیں۔ اگر وہ متضاد باتیں نہیں کرنا چاہتے تو انہیں یوں کہنا چاہیے کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ کوئی گروہ اپنے بچوں کو ایسے عقائد کی تعلیم نہ دے جو ہمارے نصاب تعلیم کے برعکس انہیں یہ سکھاتے ہوں کہ سب مذاہب کے اصول ایک نہیں ہیں۔ لیکن اگر کوئی گروہ اوقات مدرسہ کے ماسوا ایسی تعلیم دینا چاہے تو ہم مجبوراً اسے برداشت کرینگے کیونکہ جبراً ہم اسے روک بھی نہیں سکتے۔ ڈاکٹر صاحب ایک معقول اور تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔

[1] نیشنل کال مورخہ ۸ر جولائی ۳۸ء

[2] ٹریبیون مورخہ ۷ر جولائی ۳۸ء

وہ کم از کم اضداد میں تمیز تو کر سکتے ہیں۔ انکے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ایک نظام تعلیمی کی پالیسی یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا جائے یا یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں ہندوستانی قومیت کا (ہندوستانیت کا نہیں بلکہ ہندوستانی قومیت کا) شعور پیدا کیا جائے۔ اگر انکے تجویز کردہ نظام کی پالیسی پہلی ہے تو وہ بتائیں کہ انکے نصاب میں کونسی چیز ہے جو کسی مسلمان بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کرتی ہو، یا پیدا کرنا درکنار اسکو کم از کم باقی ہی رکھتی ہو؟ اور اگر انکی پالیسی دوسری ہے تو وہ صاف صاف اس بات کا اقرار کیوں نہیں کرتے کہ ہم اسلامی قومیت کا شعور مٹا کر ہندوستانی قومیت کا شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا ہے کہ وہ صریحاً دوسری پالیسی اختیار بھی کرتے ہیں، اور پھر مسلمانوں کو یہ بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے بچوں میں سے اسلامی قومیت کا شعور مٹانا نہیں چاہتے؟ اگر وہ شمال کیطرف چل کر یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ جنوب کیطرف جانا چاہتے ہیں ان کا مقصود بھی فوت نہ ہوگا، تو وہ ہمیں معاف فرمائیں، ہمیں انکے ذی عقل ہونے میں بھی شبہ ہے۔ اور اگر وہ ارادہ ہی رکھتے ہیں کہ جنوب کیطرف پہنچنے کی خواہش رکھنے والوں کا مقصد فوت ہو جائے، مگر انہیں یقین یہ دلانا چاہتے ہیں کہ ان کا مقصد فوت نہ ہوگا تو پھر منافقت کا شدید تر الزام ان پر عائد ہوتا ہے، اور بہتر ہے کہ وہ اس سے بچنے کی کوشش فرمائیں۔

وردھا اسکیم کے انگریزی ایڈیشن میں تفصیلی نصاب درج کیا گیا ہے، افسوس کہ اس کا ترجمہ اردو میں شائع نہیں کیا گیا ورنہ اسے دیکھنے کے بعد ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نصاب میں مسلمان بچوں کے شعور اسلامی کو فنا کرنیکا کس قدر مکمل انتظام کیا گیا ہے۔

مادری زبان کے شعبہ میں تیسرے درجہ والوں کو بودھ، عیسیٰ اور محمدؐ کی اور چوتھے درجہ والوں کو بڑے بڑے آدمیوں، مثلاً زرتشت، سقراط، حسینؓ، ابرہام لنکن، ٹالسٹائے، سن یات سین اور گاندھی کی کہانیاں پڑھائی جائینگی۔

سماج کے علم میں ویدک عہد کی کہانیوں کیساتھ موسیٰ، ابراہیم اور مارکس اریلیس کے حالات

اور درجہ چہارم میں قدیم ہندوستان، بدھ مت چین اور عیسائی اور عیسائیوں کے حالات بتائے جائینگے۔

درجہ پنجم میں خاص طور پر اسلامی دور کو رکھا گیا ہے اور اسکے خاص خاص مضامین یہ ہیں:

۱۔ محمدؐ، عمرؓ، علیؓ، حسینؓ، عمر ابن عبدالعزیز کے حالات۔

۲۔ ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کی ابتدا۔ محمد بن قاسم۔ خواجہ معین الدین چشتی۔

۳۔ ہندی اسلامی تہذیب کے ارتقار کی داستان۔

۴۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب ایک دوسرے پر کس طرح اثرانداز ہوئے۔ اس کی توضیح امیر خسرو، کبیر، گرونانک، اکبر اور داراشکوہ کے حالات سے۔

۵۔ مشترک تمدنی زندگی کا ارتقار:۔ غذا، لباس، تفریحات، مشترک تہوار، معاشرتی رسوم اور آداب و اطوار۔

۶۔ مشترک سیاسی زندگی اور ملکی نظم و نسق: شیر شاہ، اکبر اور ٹوڈرمل۔

۷۔ زبان و ادب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور "ہندوستانی" کا ارتقار بحیثیت مشترک زبان کے۔

۸۔ فنون لطیفہ اور موسیقی۔ امیر خسرو، تان سین۔ ہندو مسلم فن تعمیر اور اسکے نمونے۔

۹۔ حسب ذیل شخصیتوں کے حالات زندگی: البیرونی، ابن بطوطہ، فیروز شاہ تغلق، بابر، جہانبانی نورجہاں، اور چند صوفی بزرگ مثلاً داود، کبیر، نانک، بابا فرید۔

۱۰۔ دنیا کو اسلامی تہذیب نے کیا دیا۔ علیؓ بحیثیت انسان اور عالم۔ بلالؓ بحیثیت نمائندہ حبشی جمہوریت۔ ہارون الرشید کی علمی سرپرستی۔ صلاح الدین بحیثیت نمائندہ شجاعت مسلمین۔ عبدالرحمن الناصر اور اندلس کی اسلامی تہذیب۔ اسلامی سلطنت کی وسعت جغرافی تعلق کیساتھ۔

اس پورے نقشہ میں دیکھیے، مسلمانوں کے پیغمبر اور مذہبی پیشوا عام مشاہیر کی صف میں بیٹھے

ہیں - بلکہ کہیں کہیں انکو گوتیوں کیساتھ بٹھایا گیا ہے۔ مسلمان بچے ان کو اس حیثیت سے نہ جانینگے کہ وہ ان کے دین کے ستون ہیں بلکہ اس حیثیت سے جانینگے کہ دنیا کے دوسرے بڑے آدمیوں میں سے وہ بھی ہیں - ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی تاریخ اس طرح ان کے دماغ میں اتاری جائیگی کہ ہندو اور مسلمانوں کے مذہب اور تہذیب کے میل جول سے جو چیز اکبر اور دارا شکوہ اور کبیر اور نانک نے پیدا کی اس کی خوبی اور معقولیت ان پر نقش ہو جائے - اس سے ان میں کبیر پنتھی اور برہمو سماجی شعور تو پیدا ہو سکتا ہے، مگر اسلامی شعور ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا - اس تعلیم کیساتھ اگر ہمارے علما نے لڑ بھڑ کر کچھ مذہبی تعلیم کا پیوند لگوا بھی دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ سارا نظام تعلیمی جس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے، جو مقصد اسکی اساس میں رکھ دیا گیا ہے اور جس تعلیمی پالیسی پر یہ تعمیر شروع سے آخر تک ہوئی ہے اس میں دینیات کی تعلیم کا جوڑ قطعاً بے نتیجہ ہوگا - اسلامی ہائی اسکولوں میں دینیات کی تعلیم سے جو کچھ نتائج حاصل کیے گئے ہیں بس ویسے ہی کچھ نتائج اس وردھا اسکیم میں بھی دینیات کی قلم لگانے سے حاصل ہو جائینگے۔

(۴) واحد قومیت، مادہ پرست سوسائٹی اور مخلوط سماج کی اس تشکیل میں اخلاقی رنگ بھی ضروری تھا، اسلیئے کہ اخلاق کے بغیر نئی ہندی تہذیب نامکمل رہی جاتی ہے - مذاہب اور انکی شریعتوں کو تو تعلیم سے خارج کر دیا گیا - اسکے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ان شہریوں کی اخلاقی تربیت کس بنیاد پر ہو؟ وردھا اسکیم نے اس سوال کو اس طرح حل کیا کہ ہند جدید کے "پیغمبر" مہاتما گاندھی کی روحانی تعلیم پر "ہندوستانی قوم" کے اخلاق کی بنیاد رکھ دی:-

"ہندوستان کی زندگی کا راستہ الگ ہے - اس نے ہر طرح کی آزادی حاصل کرنے کیلیے اہمسا کا طریقہ لیا ہے - ہمارے بچوں کو یہ سکھانیکی ضرورت ہے کہ اہمسا کا طریقہ ہمسا سے اچھا ہے" (جامعہ صفحہ ۱۱۱)

"جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان

کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہییں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہییں جن سے اہمسا اور اسکے ساتھ کی خوبیوں کا اہمسا اور دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو" (ص ۱۱۹)

اس طرح تمام مذاہب کی تعلیم خارج کر کے مہاتما گاندھی کے مذہب کی تعلیم داخل کردی گئی۔ اب جو نسل ہندوستان کی درسگاہوں سے پرورش پاکر نکلے گی اس کے اخلاقی تصورات دین گاندھی پر مبنی ہونگے۔ ہندوستان کی زندگی کا راستہ ـــــ اور مذہب کا کوئی مفہوم اسکے سوا نہیں کروہ زندگی کا راستہ ہی ہے ـــــ یہ ہوگا کہ وہ جہاد بالسیف کو دھوکے اور دغا کا قریبی رشتہ دار سمجھیگا اور اہمسا کو عقیدۃً اس پر ترجیح دیگا۔

سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم لازماً اور جبراً دی جائیگی اور اس عمر میں یہ بچے اس نظام تعلیمی کے سوا کسی دوسرے نظام تعلیم میں شامل نہ ہو سکینگے، اور جو والدین خود غیر تعلیم یافتہ ہیں یا جن کے پاس مالی ذرائع مفقود ہیں وہ بطور خود بھی انکی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ کرسکینگے۔ حد سے حد پانچ فی صدی آدمیوں نے اگر اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام کر بھی لیا تو وہ بس موجودہ نسل تک ہے۔ دوسری نسل جو وردھا اسکیم کے مدرسوں سے تعلیم پاکر اٹھے گی اس پر مادی نقطۂ نظر اور جدید ہندی قومیت کے تصورات کا اتنا غلبہ ضرور ہوگا کہ اسے اپنی اولاد کو مذہبی تعلیم دینے کی زیادہ پروا نہ ہوگی۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہیے کہ تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان "ایک قوم" بن جائیگا۔

انگریزوں نے کال سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے میکالے کی تعلیمی اسکیم نافذ کی تھی جس نے آدھے ہندوستانیوں کو پورا انگریز بنایا اور پورے ہندوستانیوں کو آدھا انگریز مگر ہندو نے ابھی سیاسی اقتدار کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا ہے اور اسی مرحلہ پر وہ اسکیم ہماری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ سے بنوائی ہے جو انشاء اللہ سارے ہندوستانیوں کو پورا "ہندوستانی" بناکر چھوڑیگی۔ اسکے بعد کسے شک ہوسکتا ہے کہ تاریخ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا مرتبہ میکالے سے بہت بلند ہے، اور یہ مہاتما گاندھی کی مہربانی

ہے کہ انہوں نے یہ شرف خود حاصل کرنے کے بجائے ڈاکٹر صاحب کیطرف منتقل کردیا!

(۱۰)

سی پی میں ایک دوسری تعلیمی اسکیم بنائی گئی ہے جو "ودیا مندر اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اسکے مصنف صوبہ کے وزیر اعظم پنڈت شکلا ہیں جو مالوی جی کے خاص چیلوں میں سے ہیں۔ انہوں نے یہ نام الہ آباد کے ودیا مندر ہائی اسکول سے لیا ہے جو مالوی خاندان کا قائم کیا ہوا ہے۔ تخیل اور نقشہ گروکل سسٹم سے ماخوذ ہے[۱]۔ کانگریس پارٹی نے ۳۰ر جولائی ۳۷ء کو انکی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی تھی جسکا مقصد دیہات میں عمومی لازمی تعلیم کیلیے ایک اسکیم وضع کرنا تھا۔ ۳۱ر اگست کو یہ کام مکمل ہوا، ۵ر نومبر کو حکومت سی پی کے تسلیم کردہ تعلیمی ادارات کی فنڈریشن نے اور ۱۴ر نومبر کو محکمۂ تعلیم کے افسروں کی مجلس نے، اور ۱۴ر دسمبر کو سی پی اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے اسے منظور کیا[۲]، مگر مارچ ۳۸ء تک اس کی زیارت نہ اسلامی تعلیمی ادارات کو، نہ اسلامی اخبارات کو، نہ خود سی پی اسمبلی کے مسلمان ممبروں کو نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کے سامنے یکایک مارچ کے اجلاس اسمبلی میں یہ اسکیم اس وقت آئی جب حکومت کے بجٹ میں اسکے لیے دو لاکھ روپیہ سالانہ کی امداد منظور کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اسمبلی کے ۱۴ مسلمان ممبروں میں سے ۱۳ نے سختی کیساتھ اسکی مخالفت کی۔ چودھویں مسلمان مسٹر شریف تھے جنہیں اس وقت وزارت کا شرف حاصل تھا۔ مگر انہوں نے بھی رکنِ حکومت ہونیکے باوجود رائے دینے سے احتراز کیا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ ۸ لاکھ مسلمانانِ صوبۂ متوسط کے باضابطہ نمائندے ہیں وہ اسے بالاتفاق نامنظور کرچکے ہیں اور اسکے بعد سے مسلمانوں کی تمام نمائندہ جماعتیں، حتی کہ

---

[۱] نیشنل کال مورخہ ۲۸ر جون ۳۸ء

[۲] "ودیا مندر اسکیم" شائع کردہ حکومت صوبۂ متوسط۔ صفحہ ۶-۷۔ میرے پاس سی پی گورنمنٹ کی شائع کردہ اردو اور انگریزی دونوں اسکیمیں ہیں مگر میں اردو والے ناظرین کی سہولت کیلیے اردو ایڈیشن ہی کا حوالہ دونگا۔

صوبہ متوسط کی مسلم قوم پرست جماعت، اور اسلامی اخبارات نے بالاتفاق اسکی مخالفت کی ہے، لیکن ۱۴ ستمبر ۳۸ء کو کانگریسی حکومت کی جانب سے جو پریس کمیونک شائع کیا گیا ہے اس میں "چند مسلمان افراد اور بعض مسلمان جماعتوں کی مخالفت" کہہ کر اس متحدہ قومی مخالفت کو ہلکا کرنیکی کوشش کی گئی ہے، بالکل اسی انداز میں، جس میں انکے انگریز اُستاد اب سے دو سال پہلے تک خود انکی چیخ پکار کو ہلکا قرار دیا کرتے تھے۔

اسکیم کو منظور کرنیکے بعد جو مجلس نصاب بنائی گئی اس میں سی پی کا ایک مسلمان بھی نہ لیا گیا بلکہ باہر سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ڈاکٹر اشرف کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ نئی سرکار کے منشا کے مطابق کام کرسکیں مسلمانوں کے یہ "نمائندے" بھی صرف نصاب کے اصول مقرر کرنے کی حد تک مامور بکار رکھے گئے۔ اصل کام تو نصاب کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانا یعنی کتب نصاب مقرر کرنا ہے جسے ٹکسٹ بک کمیٹی کرتی ہے، اور اس کمیٹی میں برائے نام بھی کوئی مسلمان نہ رکھا گیا۔ یہ بالکل اس کمیٹی کے اختیار میں ہے کہ اصولوں کو جس شکل میں چاہے ڈھال دے، اور یہ اختیار بالکل ہندوؤں کا حصہ ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ سی پی کے محکوم مسلمان اپنی آئندہ نسل کی تعلیم کے معاملہ میں کچھ نہیں بول سکتے۔ انکے نئے حکمراں جو کچھ انکے حق میں فیصلہ کردیں اسکے آگے انہیں سر جھکا دینا چاہیے۔ یہ ہے اُس "سوراج" کی حقیقی تصویر جس کے لیے کانگریس جدوجہد کر رہی ہے اور اس تصویر کو قبولیت کا شرف جناب مولانا ابوالکلام نے عطا فرمایا ہے کہ ۲۵ جون ۳۸ء کو آپ بنفس نفیس ودیا مندر ٹریننگ اسکول (وردھا) میں تشریف لے گئے اور "قومی تہذیب" کو ترقی دینے والے اس ادارہ کی مدحت سرائی فرمائی۔[1]

یہ اسکیم خالصتہً دیہی علاقوں کیلیے بنائی گئی ہے[2]، یعنی اسکا اثر سی پی کے ان لاکھوں مسلمانوں پر

[1] نیشنل کال مورخہ ۲ جون ۳۸ء۔ "قومی تہذیب" کا لفظ خود حضرت والا ہی کی زبانی اس اخبار نے نقل کیا ہے۔

[2] سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر ۳۸ء۔

پڑیگا جو ۶۲، ۳۹ قریوں میں بکھرے ہوئے اور ۹۸ فیصدی ہندو اکثریت میں گویا آٹے میں نمک کی حیثیت سے پھیلے ہوئے ہیں۔ نئی کانگریسی حکومت، انکی تعلیم کا انتظام کرنے کا ذمہ نہیں لینا چاہتی بلکہ یہ چاہتی ہے کہ یہ لوگ ۹۸ فیصدی ہندو اکثریت کیساتھ مل کر اس تعلیمی انتظام کو قبول کریں جو مجموعی طور پر کیا جائے[۱]۔ اسی غرض کیلیے یہ اسکیم بنائی گئی ہے۔ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) جو مدارس اس اسکیم کے تحت قائم کئے جائینگے انکا نام "ودیا مندر" تجویز کیا گیا ہے۔ لفظ مندر سے صاف مذہبیت کی بو آتی ہے۔ ایک عام ہندوستانی "مندر" کے معنی ہندوؤں کی عبادتگاہ ہی کے سمجھتا ہے۔ کانگریسی پی کی حکومت اور مہاتما گاندھی، دونوں کو اصرار ہے کہ یہ نام قابلِ اعتراض نہیں ہے[۲]۔ گویا اس امر کا فیصلہ کہ مسلمانوں کیلیے کیا چیز قابلِ اعتراض ہونی چاہیے اور کیا نہ ہونی چاہیے، خود مسلمانوں کے کرنیکا بلکہ انکی نئی حکمرانوں کے کرنیکا ہے۔ اس پر مزید فریب کاری ملاحظہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے خرچ سے جو مدرسے قائم کریں انکا نام ودیا مندر نہیں، بیت العلم رکھ لیں[۳]۔ مگر اسکیم کے تحت مدرسہ صرف اس جگہ قائم کیا جا سکتا ہے جہاں کم از کم چالیس لڑکے پڑھنے والے ہوں اور جس کیلیے کم از کم دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائداد وقف کی جائے[۴]۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلمان اتنی اقلیت میں ہیں کہ انکی آبادی سے ۴۰ لڑکے فراہم نہیں ہو سکتے، یا جہاں وہ اس قدر غریب ہیں کہ مطلوبہ زمین وقف نہیں کر سکتے وہاں ان کے بچوں کو صبح اٹھ کر مندر جانے کی تیاری کرنی ہوگی۔ اس کا نفسیاتی اثر جو کچھ آئندہ نسل پر ہوگا اسکا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

(۲) اسکیم سردست اختیاری ہے، مگر آگے چل کر اسکو جبری بنا دیا جائیگا، یعنی ہر اس گاؤں یا مجموعہ دیہات کو جس سے چالیس لڑکے لڑکیاں فراہم ہوں ایک ودیا مندر لازماً قائم کرنا ہوگا۔

---

[۱] "ودیا مندر اسکیم" صفحہ ۲

[۲] ہریجن مورخہ ۱۵ اکتوبر ۳۷ء - اور سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر ۳۷ء۔

[۳] سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر۔

[۴] ودیا مندر اسکیم۔ صفحہ ۲-۸

وہاں لوگوں کو مجبور کیا جائیگا کہ دو سو روپے ماہانہ آمدنی کی جائداد وقف کریں - اور اس علاقہ کی تمام خیرات بھی ودیا مندر کیطرف منتقل ہوگی[1] اسکیم کے آخر میں ارشاد ہوا ہے:

"چھوٹے بڑے مٹھوں اور دیگر مذہبی اور خیراتی اداروں، مندروں، مسجدوں وغیرہ کے مالکوں اور متولیوں کو احساس ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ از خود پیش قدمی کریں اور اس سے پہلے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اپنی خدمات پیش کرنیکا فخر حاصل کریں (اسکیم - صفحہ ۱۵)

اسکے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک جبری ولازمی اسکیم ہے اور مسلمانوں کے مذہبی اوقاف اور مساجد کے اوقاف بھی اس میں حصہ لینے پر مجبور کیے جائینگے -

(۳) ہر مدرسہ کیلیے ایک کمیٹی بنائی جائیگی جسکے ارکان کا بیشتر حصہ حق رائے دہندگی بالغان کے اصول پر مخلوط انتخاب سے منتخب ہوگا - اور مدرسہ کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ دیہاتی پنچایت یا ڈسٹرکٹ کونسل یا حکومت صوبہ کی ملک متصور ہوگی[2] - اسکے معنی یہ ہیں کہ مسلمان انتظام سے بھی بے دخل اور ملکیت سے بھی بیدخل - ان کا کام صرف اپنا مال اور اپنے بچے حوالہ کر دینا ہے -

(۴) مدرسہ میں عموماً ایک ہی مدرس ہوا کریگا جسے ۵ سال کیلیے امتحاناً مقرر کیا جائیگا، پھر ۵ سال کیلیے مستقل کر دیا جائیگا - اگر کمیٹی کی رائے میں اسکا رویہ نامناسب ہو تو وہ اسے نکال دیگی - اسکے فرائض یہ ہونگے کہ مقررہ نصاب کے مطابق تعلیم دے اور گاؤں کے تمام معاملات کو "قومی رنگ" (National Out Look) میں رنگنے کی کوشش کرے[3] - قومی رنگ کا مطلب صاف ہے - بچوں میں اور اپنے

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶ - ۸ - ۹ - ۱۵

[2] ایضاً صفحہ ۱۰ و ۱۱

[3] ایضاً صفحہ ۱۳ و ۱۴

زیر اثر آبادی میں واحد قومیت کی روح پھونکنا اور ملی امتیاز کو مٹا دینا۔ یہ کام قریب قریب کلیتہً ہندو مدرسین ہی سے لیا جائیگا۔ مسلمان کا اول تو انتخاب میں آنا مشکل۔ اور اگر کوئی قسمت کا مارا آ گیا تو کمیٹی یہ کہہ کر بآسانی اسے نکال دیگی کہ یہ "قومی رنگ" نہیں دیتا یا مقررہ نصاب کے خلاف بھی کچھ (یہی کلمہ و نماز وغیرہ) سکھاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سات برس تک مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو (اس لیے کہ تعلیم مخلوط ہوگی[1]) کلیتہً ایک ہندو استاد کے زیر اثر اور کثیر التعداد ہندو بچوں میں گھرا ہوا رہنا پڑے گا جہاں "قومی رنگ" ہر طرف سے ان کو محیط ہوگا اور خدا اور رسول کا نام تک ان کے کانوں میں نہ پڑے گا کجا کہ اسلامی زندگی کا کوئی نشان وہ دیکھ سکیں۔

(۵) اغراض و مقاصد میں تصریح کی گئی ہے کہ گاؤں کے بچوں میں "قومی نقطۂ نظر" پیدا کیا جائیگا۔ "ودیا مندر ایک اہم سوشل مرکز کا کام دیگا جہاں استاد بچوں کے والدین، لڑکے لڑکیاں سب جمع ہو کر ان مسائل کو جن سے انکو سابقہ پڑتا ہے بحث مباحثہ کر کے حل کرنے کی کوشش کرینگے خواہ وہ مسائل "قومی" ہوں، سوشل ہوں یا تعلیمی[2]"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ودیا مندروں کے ذریعہ سے دیہات کی منتشر و پراگندہ مسلمان آبادی کو کثیر التعداد ہندو آبادی میں جذب کرنے کی ایک منظم کوشش کی جائے گی اور تربیت یافتہ مہاشے تمام دیہی علاقوں میں پھیلا دیے جائیں گے تاکہ وہ گاؤں کی پوری زندگی کو اپنے گرد مرتکز کر لیں اور نہ صرف تعلیم کے ذریعہ سے بلکہ سوشل اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ سے بھی سب کو ایک اجتماعی وحدت بنا دیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ دیہات کی مسلمان آبادی خود بخود ناپید ہو جائے گی اور چند سال بعد جو مسلمان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھینگے تو انہیں معلوم ہوگا کہ وہ صرف شہروں

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۸

[2] " " "

میں رہ گئے ہیں، اصلی ہندوستان یعنی دیہی ہندوستان میں ان کا کہیں پتہ نہیں۔

(۶) ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو گی اور مادری زبان کی تفسیر حکومت کے کمیونک میں یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد علاقہ کی زبان ہے[1]۔ یعنی وہ زبان نہیں جو بچہ کی ماں بولتی ہے بلکہ وہ زبان جو علاقہ کی ماں بولتی ہے۔ اب صوبۂ متوسط میں تلاش کیجیے کہ کونسا علاقہ ہے جس کی ماں اردو بولتی ہو۔ وہاں کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کی مائیں تو سب کی سب خالص اردو بولنے والی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی علاقے دو ہی قسم کے ہیں، یا مرہٹی بولنے اور لکھنے والے، یا ہندی (ناگری رسم الخط کے ساتھ) لکھنے اور بولنے والے۔ لہٰذا مادری زبان کی تفسیر علاقہ کی زبان سے کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اردو خود بخود خارج از بحث ہو گئی۔ مسلمان اگر چاہیں تو اردو مدرسہ قائم کر سکتے ہیں، مگر صرف اس جگہ جہاں وہ چالیس بچے اردو پڑھنے والے فراہم کریں اور دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائداد دے سکیں۔ جہاں اقلیت یا غربت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکیں گے (اور شائد سی پی میں بہت ہی کم مقامات پر وہ ایسا کر سکیں گے) وہاں ان کے بچوں کو مرہٹی یا ہندی میں ہی سب کچھ پڑھنا ہو گا۔ اس کے بعد "متحدہ قومیت" آپ سے آپ پیدا ہو گی۔

(۷) حکومت کی پوری طاقت اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں صرف ہو گی۔ ابتداءً ہر تعلقہ اور تحصیل میں حکومت اپنے خرچ سے چند دو یا مندر قائم کرے گی۔ مدرسوں کی تنخواہیں حکومت کے خزانہ سے ملیں گی۔ دو یا مندر تعمیر کرنے کے لیے

[1] سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۲ ستمبر ۳۸ء۔

ضروری سامان بھی حکومت دے گی[1]۔ تمام سرکاری محکمے ودیا مندر کی پشت پر مدد کے لیے حاضر رہیں گے۔ محکمۂ زراعت، محکمۂ طبابت وحفظانِ صحت، محکمہ امداد باہمی، محکمۂ علاج حیوانات، محکمۂ تعلیم، غرض سب اپنے اپنے دائرہ میں ودیا... مندروں کو مادّی، علمی وفنی اور اخلاقی ونفسیاتی امداد دینگے۔ یہ معنی ہیں قومی جمہوری حکومت کے۔ ۸ لاکھ مسلمان اس جمہوریت کا ایک جز ہیں تو ہوا کریں۔ دولت مشترکہ کی پیدائش میں ان کا حصہ ہے تو ہوا کرے۔ مگر ہیں تو وہ اقلیت میں۔ لہذا جس دولت اور طاقت فراہم کرنے میں ان کا حصہ ہے اس کا مصرف متعین کرنے میں ان کا حصہ نہیں ہے۔ اس کو اکثریت اپنے منشا کے مطابق استعمال کرے گی اور ایسے کاموں میں استعمال کرے گی جو ان بے زور حصہ داروں کی ہستی ہی کو ختم کردیں۔

(۸) سی پی میں ابتدائی تعلیم لوکل بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کے حدود عمل سے تعلق رکھتی ہے، اور چونکہ ہر جگہ اکثریت ہندوؤں کی ہے اسلیے یہ جماعتیں اردو مدرسوں کو بند کررہی ہیں اور ان کی جگہ ودیا مندر قائم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ مسلمان اپنی اقلیت کے باعث کسی طرح اس ظلم کو نہیں روک سکتے۔ آگے چل کر آپ دیکھینگے کہ ان مجلسوں کی پوری طاقت ودیا مندر قائم کرنے میں صرف ہو گی۔ جو ٹیکس مسلمانوں سے لیا جائے گا وہ ان کی مرضی اور ان کے مفاد کے خلاف صرف کیا جائے گا اور مسلمانوں کے احتجاج کو استحقار کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے گا۔ حال میں ضلع امراؤتی کی وَرُوڈ میونسپل کمیٹی نے اردو اسکول کو اردو ودیا مندر بنا دیا، مسلمانوں نے احتجاج

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۱۱

کیا، مگر پرکاہ کے برابر بھی اسکی وقعت نہ کی گئی[۱] - سچ فرمایا پنڈت جواہر لال نہرو نے - جمہوریت کے معنی یہی ہیں کہ اکثریت اقلیت کو دبا کر رکھے!

(۹) درد ھا میں ودیا مندروں کیلیے اساتذہ تیار کرنے کا انتظام کیا گیا ہے اور ایک ٹریننگ اسکول قائم کر دیا گیا ہے - اس میں ۱۶۲ ہندو اور ۸ مسلمان تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں اور حکومت صوبہ متوسط نے اپنے احسانات کی جو فہرست گنائی ہے اس میں ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو اردو کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ وہ ودیا مندروں میں جاکر بچوں کو اردو اور ہندی دونوں سکھا سکیں[۲] - مگر اصل حالات کیا ہیں؟ اس صوبہ کے قوم پرست مسلمانوں تک نے اپنی کانفرنس میں شکایت کی ہے کہ سارا زور صرف ہندی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اور اردو کی محض شُدبُد پیدا کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ یہ ودیا مندروں میں اردو تعلیم کے انچارج ہوں - جن بیچاروں کا املا اور تلفظ تک درست نہیں، جو اردو کی معمولی عبارت تک صحیح نہیں پڑھ سکتے وہ ہمارے بچوں کو اس زبان کی تعلیم دینے جائینگے[۳]

سی پی اسمبلی کے ممبر مولوی عبدالرحمٰن خانصاحب جب اس ٹریننگ اسکول کا معائنہ کرنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہندو مسلمان سب کے سب دھوتیاں باندھے ہوئے تھے - یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ ان میں مسلمان کون ہے - تمام مضامین ہندی اور مرہٹی میں پڑھائے جاتے ہیں - محض اردو رسم الخط سکھانے کیلیے ایک مسلمان استاد نوکر رکھا گیا ہے - مسلمان طلبہ اچھوتوں کیطرح رہتے ہیں، الگ کھاتے ہیں، پانی پینے کے برتنوں تک کو ہاتھ نہیں لگا سکتے - روزانہ بندے ماترم سے مدرسہ شروع ہوتا ہے

[۱] سی پی اسمبلی میں سوال نمبر ۱۹۶ کا جواب مورخہ ۸ مارچ ۳۸ء

[۲] حکومت سی پی کا پریس کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر ۳۸ء

[۳] مدینہ مورخہ ۲۸ جولائی ۳۸ء

اور مسلمان طلبہ کو مجبور کیا جاتا ہے (یا اگر مجبور نہیں تو تربیت سے ایسا بنایا جاتا ہے) کہ پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر کھڑے ہوں[۱]۔ یہ ہے وہ مدرسہ جس میں "قومی تہذیب" کے نشو و نما پر جناب مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ نے اظہار مسرت فرمایا ہے اور جس کا افتتاح مہاتما گاندھی کی "برکتوں" کے ساتھ ہوا ہے[۲]!

---

[۱] مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کا مضمون مندرجہ انقلاب ۲۲ اگست ۱۹۳۸ء

[۲] ورد ھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم پر مسلمانوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں، ان کے جواب میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی بار بار دہرائی جا رہی ہے کہ جس ملک میں بہت سے مذاہب کے پیرو رہتے ہوں وہاں سب کی مذہبی تعلیم کا انتظام حکومت کیسے کر سکتی ہے۔ ایسی جگہ تو حکومت کی طرف سے عام دنیوی تعلیم ہی کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اور تعلیم کو عام کرنے کیلئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وسیع پیمانے پر لازمی جبری اور غیر مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن عام ناظرین کی معلومات کے لئے میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یورپ کے سخت "مہذب" ممالک میں بھی جہاں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے فرانس، چیکوسلواکیا، روس اور دو چار دوسرے ملکوں کے سوا کسی ملک نے وہ پوزیشن اختیار نہیں کی جو یہاں ہندوستان میں اختیار کی جا رہی ہے۔ جرمنی میں باشندوں کی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے اور یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے کہ سب کی تعلیم کا نظام ایک ہونا چاہئے۔ اس بنا پر وہاں پرائیویٹ مدارس قائم کرنے کی اجازت بھی کم دی جاتی ہے۔ لیکن دستور سلطنت میں ہر شخص کو یہ مطالبہ کرنے کا حق دیا گیا ہے کہ اس کے بچے کو اس کے عقیدہ کے مطابق مذہبی تعلیم دی جائے اور حکومت کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اوقات مدرسہ میں اس تعلیم کا انتظام کرے۔ نیز اگر ایک مذہبی عقیدہ کے لوگ کسی جگہ کافی تعداد میں ہوں اور وہ مطالبہ کریں کہ ان کے لئے الگ مدرسہ قائم کیا جائے جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ان کی خواہش کے مطابق ہو تو حکومت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۱۱)

ان تفصیلات سے اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "جنگ آزادی" کے نام سے برطانوی حکومت کے زیر سایہ بتدریج سیاسی طاقت حاصل کرنے کی جو پالیسی اختیار کی گئی ہے وہ کس طرح مسلمانوں کی قومیت اور اُن کی قومی طاقت کو فنا کرنے کے لئے استعمال کیجا رہی ہے' اور کس طرح ہمارے ہمسایہ رفیق قومی امپیریلزم کے وہ تمام ہتھکنڈے اختیار کرتے جا رہے ہیں جنکو اُنہوں نے اپنے انگریز اُستادوں سے سیکھا ہے۔ لیکن یہ بیان نامکمل رہ جائیگا اگر اسی سلسلہ میں ان کارروائیوں کا بھی ذکر نہ کر دیا جائے جو زبان کے باب میں کی جا رہی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) کا فرض ہے کہ اس کا انتظام کرے۔ انگلستان میں مذہبی تنظیمات کو خود اپنے مدارس قائم کرنے اور چلانے کا حق ہے اور حکومت کا محکمۂ تعلیم صرف اُن کی نگرانی کرتا ہے۔ ایسے مدارس کو حکومت مالی امداد بھی دیتی ہے۔ یوگوسلیویا میں ہر تسلیم شدہ مذہب کی تعلیم کا انتظام سرکاری مدارس میں کیا جاتا ہے اور ہر بچے کے والدین پر اسکا فیصلہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لئے کس نوعیت کی مذہبی تعلیم چاہتے ہیں نیز وہاں تسلیم شدہ مذاہب کو اپنے تعلیمی نظام خود بنانے کا بھی حق ہے اور حکومت کے خزانہ سے اُن کی اعانت کیجاتی ہے۔ لیتھوانیا کے سرکاری مدارس میں بچوں کے لئے مذہبی تعلیم لازمی رکھی گئی ہے۔ اور صرف وہ بچے اس سے مستثنیٰ کئے گئے ہیں جن کے والدین مذہبی تعلیم نہ دلوانا چاہتے ہوں۔ اس کے علاوہ وہاں بھی مذہبی تنظیمات کو اپنے مدارس خود قائم کرنے کا حق ہے اور حکومت انکو اس شرط کیساتھ امداد دیتی ہے کہ ان میں دنیوی تعلیم کا انتظام سرکاری تعلیمی پالیسی کے مطابق کیا جائے گا۔ پولینڈ کے تمام سرکاری اور امدادی مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے' اور یہ کام مختلف مذاہب کی تسلیم شدہ انجمنوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے پیروؤں کے لئے خود نصاب تجویز کریں اور مدارس میں ان کی مذہبی تعلیم کی نگرانی کریں۔ ایستھونیا میں بچے کے والدین کی درخواست پر سرکاری مدارس (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایک قوم کی زبان اور اُس کا رسم الخط اُس کی تہذیب اور اُس کی قومیت کے بقا و فنا میں فیصلہ کُن اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اُس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجئے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اُس کی آنیوالی

(بقیہ حاشیہ) میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے لئے لازم ہے۔ ملاحظہ ہو:-

THE NEW DEMORATIC CONSTITUTIONS OF EAUROPE.

BY AGNES HEEDLAM - MORLEY, P 53 - 57

بلجیم میں جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور تسلیم شدہ مذاہب کے کلیساؤں کو حق دیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی نگرانی کے لئے اپنے انسپکٹر مقرر کریں۔ ناروے میں ابتدائی تعلیم تمام تر مذہبی تنظیمات کے ہاتھ میں رکھی گئی ہے۔ اٹلی میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور کوئی بچہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کے والدین استثناء کا مطالبہ نہ کریں۔ ہالینڈ میں مذہبی تنظیمات اپنے اپنے پیروؤں کی تعلیم کا انتظام خود کرتی ہیں اور حکومت اس کا خرچ ادا کرتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں سرکاری طور پر صرف اس مذہب کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے جس کے پیروؤں کی تعداد مدرسہ میں زیادہ ہو۔ لیکن جن اقلیتوں کی کافی تعداد موجود ہو ان کے لئے علیحدہ انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا چودھواں ایڈیشن مضمون ایجوکیشن)

اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ پبلک مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام ممکن نہیں ہے۔ صاف کیوں نہیں کہا جاتا کہ قومیتوں کو فنا کرنے اور قوموں کے احساسِ خودی کو مٹانے کے لئے ہم اس چیز کو قصداً نہیں رکھنا چاہتے۔

نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لیکر اٹھینگی۔ جن جن لوگوں نے قومیتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے اُن سب نے یہ ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے۔ زار روس کی حکومت نے اپنے امپیریلزم کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے روسی زبان اور رسم الخط کو تمام غیر روسی قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ سب قومیں روسی بن جائیں، اور اُس کی مملکت میں کوئی قوم ایسی نہ رہ جائے جو خود اپنی زبان بولنے والی اور اپنے مذہب کا اتباع کرنے والی اور اپنے رسوم پر چلنے والی ہو۔ اصطلاح میں اس کو RUSSIFICATION یعنی "روسی بنانے" کی پالیسی کہا جاتا ہے۔ بعد میں اسی پالیسی کی پیروی اشتراکی جماعت نے بھی کی۔ لینن نے انقلاب کے بعد ہی مشرقی قوموں کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اُن کے رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدل دیا اور اب تازہ اطلاع ہے کہ روس کی ۲۹ قوموں کا رسم الخط لاطینی کے بجائے روسی کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اُس علیحدگی کے احساس کو بالکل مٹا دیا جائے جو اُن کے روسی بن جانے میں مزاحم ہوتا ہے۔ ازبک، ترکمان، تاجیک، کرغیز اور داغستانی مسلمان جن کو عربی رسم الخط نے اسلامی روایات سے وابستہ کر رکھا تھا، اس ضرب کے اثرات کو ابھی سے محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی تک چوتھائی صدی بھی اس انقلاب پر نہیں گزری ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی قومیت تحلیل ہو کر اشتراکی سوسائٹی میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں اختیار کی ہے وہاں عربوں اور بربریوں کو فرانسیسی قومیت میں ڈھالنے کے لئے ساری طاقت اس پر صرف کی جا رہی ہے کہ عربی زبان اور رسم الخط کو مٹا دیا جائے۔ اسی پالیسی کا تختۂ مشق ہندوستان میں ہم کو بنایا جا رہا ہے۔

پنڈت جواہر لال کے بقول ہندوستان میں "نیشنلسٹ" جماعت کی خواہش اور کوشش

یہ ہے کہ "یہاں ایک متحد قوم پیدا ہو"[1]۔ اس غرض کے لئے زبان کی وحدت ناگزیر ہے۔ زبانیں الگ ہونگی تو الگ قومیں بھی رہینگی۔ الگ قوموں کو فنا کر کے ایک قوم میں تبدیل کرنا ہو تو الگ زبانوں کو مٹا کر دولت، تنظیم اور حکومت کی طاقت سے ایک زبان تمام ملک میں پھیلانی ہی پڑیگی۔ یہاں تک تو بات کھلم کھلا ہے۔ اس کے بعد کام تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ باتیں دکھانے کے لئے ہیں اور کچھ کرنے کے لئے۔ دکھانے کے لئے تو یہ ہے کہ "قومی" زبان "ہندوستانی" ہے جس کا اطلاق اُردو اور ہندی دونوں پر ہوتا ہے۔ فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط مسلّم ہیں اور دونوں کو نشوونما کا پورا موقع ملنا چاہئے۔ لیکن فی الواقع کیا کیا جا رہا ہے؟ اس کے لئے ذیل کی تفصیلات ملاحظہ ہوں:-

(۱) فارسی اور عربی کے وہ عام فہم الفاظ بھی جو "ہندوستانی" کے مشترک سرمایہ میں مدتوں سے داخل ہو چکے ہیں، جن کو ہر ہندو اور مسلمان بولتا اور سمجھتا ہے، قصداً ترک کئے جا رہے ہیں اور اُن کی جگہ ٹھیٹھ سنسکرت اصل کے، یا بالکل نامانوس ہندی زبان کے الفاظ پھیلائے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر

مشہور	بجائے	پرسدھ	تعلیم	بجائے	شکشا	وقت	بجائے	سمے
شہر	"	نگر	صوبہ متحدہ	"	جکت پرانت	آدمی	"	منش یا پرش
ضروری	"	اوشک	مقدمہ	"	ٹنٹا	شیر	"	سنگھ
آزادی	"	سوتنترتا	صدر	"	سبھاپتی	بندر	"	وانر
صوبہ	"	پرانت	ہندوستان	"	بھارت ورش	دوستی	"	مترتا
صوبہ متوسط	"	پرانت کوشل	حاکم	"	اتتھ	ترقی	"	اُنتی

[1] "جامعہ" اکتوبر ۳۶ء

پوتھی	بجائے	مسل	مت بھید	بجائے	اختلاف	لاگو	بجائے	نافذ
جھگڑا بکھیڑو	"	مدعی	پرستاؤ	"	تجویز	ودربھا	"	برار
سدھانت	"	اصول	سنشودھن	"	ترمیم	اگوا	"	لیڈر یا رہنما
گھوشن	"	اعلان	گرہن	"	منظور	جھگڑادوجے	"	مدعا علیہ

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ اس فہرست کو بہت زیادہ طویل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اتنی ہی مثالیں یہ اندازہ کر لینے کے لئے کافی ہیں کہ یہاں "ہندوستانی" کے پردے میں دراصل ہندی زبان کو قومی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہندوستانی قوم" کے بجائے دراصل "ہندو قوم" میں اس ملک کی قوموں کو جذب کرنا مقصود ہے۔ ہندوستانی زبان و ادب میں سے ہمارے حصہ کو اس طرح نکال پھینکنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس طرح کوئی قوم کسی ظالم قوم کی حکومت سے آزاد ہونے کے بعد جوشِ انتقام میں اُس کے باقی ماندہ آثار کو مٹایا کرتی ہے۔

(۲) متحدہ قومیت کے علمبردار جو زبان اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کر رہے ہیں اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ گاندھی جی بھارتیہ ساھتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں فرماتے ہیں:۔

> دو اس سبھا کا پتیتو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساھتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا۔ تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کرینگے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائینگے یدی ہم شری نگر سے لیکر کنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر ڈبرو گڈھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں۔

تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساھتیہ کار بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی پتھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں[1]"

آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیم صوبہ متحدہ کی ایک تقریر کا اقتباس یو-پی کے محکمۂ اطلاعات کی رپورٹ سے :-

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک وشیشتا ہے کہ سکشت شمیا کے پرت لوگوں کا اگرشٹر بہت وشدھ اور بیاپک ہوگیا ہے - یہ بات ادھکانش بیشئے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس شیوبیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا انبھو کر رہے ہیں - آجکل ہم اپنے کو جس مانسک اور پدھارتک پرستھت میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھت کا جو سماجک راج نیتک اور آرتھک آدھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے اُس سے اس وشیو دیاپی پرگت کو ہمارے سمکھ نش سندیہ ایک وشیس روپ میں اپستھت کیا ہے اور ایک وشیس بھارتیہ سمسیہ بنا دیا ہے[2]"

بابو موہن لال سکسینہ صدر صوبہ کانگریس کمیٹی کے خیر مقدم میں بیلی بھیت کی کانگریس کمیٹی حسب ذیل اعلان شائع کرتی ہے :-

"ہمارے صوبہ کے پرسد نیتا شری یت موہن لال جی سکسینہ ایم-ایل اے

---

[1] جامعہ مئی ۱۹۳۶ء۔ [2] مدینہ ۱۳ ستمبر ۳۸ء

(سینٹرل) جو پرانتی کانگریس کمیٹی کے پردھان ہیں، ۲۷ رمئی ۱۹۳۸ء کو پرات کال ۵ بجے کی گاڑی سے پدھار رہے ہیں. جنتا کو چاہئے کہ اس سنہرے اوسر سے لابھ اُٹھانے کے لئے یوب ویش کے پرت اپنے سچے کرتو کو جاننے کے لئے ۲۶ رتاریخ کی شام کو اعتماد معک سنکھیا میں راشٹر سا کاؤں کیساتھ میں آجانا چاہئے اور ۲۷ رمئی ۱۹۳۸ء کی صبح کو ۵ بجے آن کے سواگت کے جلوس کی رونق بڑھایئے۔

پروگرام ۲۷ رمئی کا

پرت کال ۷ بجے سے ۹ بجے تک جلوس

" ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک جل پان

مدھیان " " ۲ بجے تک بھوجن وشرام

۲ " ۵ " کاریہ کارتاؤں کی بیٹھک

نویدک

دستخط پریزیڈنٹ دستخط اوپ منتری

شہر منڈل کانگریس کمیٹی۔ پیلی بھیت"

اس حمام میں سوشلسٹ ہندو بھی بے تکلف کپڑے اُتار دیتے ہیں۔ حال میں آگرہ کی سوشلسٹ جماعت کی طرف سے ایک جلسہ کا اعلان بدیں الفاظ ہوا ہے:۔

"آگرے میں سماج وادی بہا خطر۔ لگاتار چھ دن تک۔ اکیل بھارتیہ سماج وادی نیتاؤں کے دوارا۔"

"ہمیں جنتا کو یہ سوچنا دیتے ہوئے پرسنتا ہوتی ہے کہ تاریخ ۱۱ راکتوبر سے برابر

چھ دن تک اکھل بھارتیہ سوشلسٹ نیتا راج نیتی کے ایک وشیوں پر اپنے شاگرد بہت اور ودّتا پورنّر بھاشنٹروں دیں گے۔ آگرہ کی جنتا کے لئے یہ اپور وا دسر ہے کی دیس ودیش کے دگج سوشلسٹوں کے سمپرک میں آکر یہ سمجھ لیں کہ برٹش سامراج وادکو کس پرکار اکھاڑ پھینکنا چاہئے۔ بھاشنٹروں کے وشئے کمیونزم، سوشلزم، پونجی واد، ورک بندھ، سامراجیہ واد، فیلسزم، نرم وگرم دل فیڈریشن، کسان کرانتی، وشو شانتی کی سمسیا۔ ودیارتھی اندولن۔ کسان مزدور اندولن۔ روس کی کرانتی سماج وادی روس۔ امتر راشٹریہ۔ خبر سبھمت آدی۔ آدی۔ بھاشنٹروں پر ویش چار آنہ کے ٹکٹ سے ہوگا۔ آپ کو ٹکٹ ہر پڑ محلہ کانگریس ودیارتھی کاریہ کرتا، تتھا وارڈ شہر کانگریس کمیٹی کے دفتر دوارا مل سکتا ہے۔ جن نیتاؤں کے آنے کی آشا ہے اُن کے نام اس پرکار ہیں:۔

"ڈاکٹر اشرف کے ایم آبھا گا کانگریس کمیٹی کے راج نیتک وبھاگ کے پردھان۔ آچاریہ نریندر دیو اکھل بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کاریکارنی کے پرمکھ سدسے تتھا کانگریس کارسمتی کے بھوت پورو سدسے۔ ڈاکٹر زیڈ اے احمد اکھل بھارتیہ کانگرسی سوشلسٹ پارٹی کی کاریکارنی کے سدسے تتھا آبھا کانگریس کمیٹی کے آرتھک دبھاگ کے بھوت پورو۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ اکھل بھارتیہ کانگریس کمیٹی کے ودیشک وبھاگ کے منتری تتھا آبھا کا سوشلسٹ پارٹی کے کاریکارنی کے سدسے۔ کامریڈ سجاد ظہیر بارایٹ لا آبھا کا سوشلسٹ پارٹی کی کاریکارنی کی سدسے۔ کامریڈ دیو مالوی یوپی کسان سبھا کی کاریکارنی کے پرمکھ سدسے۔

" دھیان رہے یہ بھاشنٹر ۱۱ اکتوبر سے شام کو ۸ بجے سے ۱۰ بجے تک ہونگے۔

استھان کی سوچنا شکر دی جائے گی۔ یہ بھاشٹر شہر کانگرس کمیٹی کانگرس سوشلسٹ پارٹی اور آگرہ و دیارتھی سنگھ کے سنیکٹ پلیٹ فارم پر ہوں گے۔

مہادیو نرائن ٹنڈن

پردھان منتری کانگرس سوشلسٹ پارٹی آگرہ

یہ محض چند نمونے ہیں۔ ورنہ یہ زبان جس طرح ذمہ دار لیڈروں اور ذمہ دار "قومی مجلسوں" سے لیکر اخبارات، رسائل اور سینماؤں تک ہر آلۂ نشر و اشاعت کے ذریعہ سے پھیلائی جا رہی ہے اس کا مشاہدہ ہر آنکھوں والا کر رہا ہے اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت کی باگیں ان لوگوں کے ہاتھ میں پوری طرح آگئیں تو یہ کیسی "ہندوستانی" زبان بنائینگے۔

(۳) اگرچہ ابھی سیاسی اقتدار پوری طرح ان کے ہاتھ میں نہیں آیا ہے، لیکن جسقدر بھی اقتدار انہیں مل چکا ہے اس کو انہوں نے عملاً اس کام میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اقتدار تو حاصل کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ ہم مشترک وطنی اغراض کے لئے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر اس اقتدار کو استعمال کیا جاتا ہے اس کام میں کہ وطن کی ایک جماعت پر دوسری جماعت کی زبان کو بزور مسلط کر دیا جائے۔ صوبہ بہار میں ۳۵ ہزار سے زیادہ مسلمان بچے ہندی مدرسوں (پاٹھ شالاؤں) میں جانے پر مجبور ہیں کہ اُن کے لئے تعلیم کا کوئی دوسرا انتظام ہی نہیں۔ پٹنہ ڈویژن میں ۵ ۷ فیصدی، چھوٹا ناگپور ڈویژن میں ۸۰ فی صدی۔ بھاگلپور ڈویژن میں ۱۷ فیصدی اور ترہت ڈویژن میں ۵۵ فیصدی مسلمان طلبہ ہندی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر جو مسلمان بچے صرف ایک صوبہ میں ہندی اللسان بنائے جا رہے ہیں اُن کی تعداد ۲۵ ہزار کے قریب ہے، یعنی کل مسلمان طلبہ کا ۷۰ فیصدی حصہ۔ اور ان کو پڑھایا کیا جاتا ہے؟ متعدد کتب نصاب میں یہ چیز آپ کو ملیگی کہ "نبی" کے

معنی "رام ادتار" کے ہیں[1]۔ ایک چانول سے اندازہ کر لیجئے کہ پوری دیگ میں کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ "اردو" کی ایک قریبی اشاعت میں اپنے ایک دوست کا خط نقل کیا ہے جو یوپی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سال مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت سے مدرسوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان میں عموماً میں نے دیکھا کہ اردو پڑھانے والے مدرسوں کی بہت کمی ہے۔ مسلمان بچوں کو مجبوراً ہندی پڑھنی پڑتی ہے، اور وہاں زبان کے واسطہ سے ان پر ہندویت کا گہرا رنگ چڑھ رہا ہے۔ مثلاً ایک ابتدائی مدرسہ میں بچے کو پکاریئے تو وہ "حاضر جناب" کہنے کے بجائے "اپستھت شریمان" کہیگا۔ یہ اس صوبہ کا حال ہے جو صدیوں سے ہماری قومی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان سب سے زیادہ بدتر حالت صوبہ متوسط کی ہے۔ ضلع بیتول کی ڈسٹرکٹ کونسل نے پورے ضلع میں جبری تعلیم نافذ کرنے کی جو سکیم بنائی ہے اس میں تعلیمی زبان لازماً ہندی رکھی گئی ہے اور حکومت نے اس شرط کے ساتھ اس کو مالی امداد دی ہے کہ تمام تعلیم ہندی میں ہو۔ اس جدید اسکیم کے ماتحت ۱۰۰ ہندی اسکول قائم کئے گئے اور پورے ضلع میں اردو کا ایک اسکول تھا سو وہ بھی بند کر دیا گیا[2]۔ یہ صرف ابتدا ہے۔ ودیا مندر اسکیم جب نافذ ہوگی تو آپ دیکھیں گے کہ دیہات کی مسلمان آبادی کو ۲۰ سال کے اندر قریب قریب کلیتہً ہندی اللسان بنا دیا جائیگا۔ ابتدائی تعلیم تمامتر لوکل بورڈوں کے قبضہ میں ہے اور وہاں حال یہ ہے کہ ۵۰ اسو انتخابی حلقوں سے

---

[1] عبدالغنی صاحب ایم ایل اے (سنٹرل) کا مراسلہ مندرجہ اسٹار آف انڈیا یکم مارچ ۱۹۳۸ء

[2] "معتوادا" مورخہ ۲ فروری ۱۹۳۸ء۔ خود سی پی کے وزیر اعظم نے بھی اپنے سرکاری کمیونک میں اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے کہ ضلع کا واحد اردو اسکول بند کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۸ جون ۱۹۳۸ء

نصف درجن مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکے۔ یہ عصبیت جہاں کام کر رہی ہو وہاں کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ پبلک کے خزانے سے کہیں اردو دیا مندر یا "بیت العلم" بھی قائم کیا جائیگا۔ لوکل بورڈوں میں تو پھر بھی محدود نظر اور پست ذہنیت کے لوگ جاتے ہیں۔ صوبہ کی حکومت جن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذمہ دار کانگریسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے خود وہی کانگریس کے اس زبانی دعوے کو جھوٹا اور منافقانہ دعویٰ ثابت کر رہے ہیں کہ "ہندوستانی" زبان اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں کے ساتھ تسلیم شدہ سرکاری زبان ہے۔ سی پی اسمبلی میں خود صدر مجلس کے زیر ہدایت رولز کمیٹی نے جو قواعد بنائے ہیں ان میں ۸ لاکھ مسلمانوں کی زبان کا نام تسلیم شدہ زبانوں کی فہرست میں کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ عبدالرحمان خاں صاحب ایم ایل اے نے جب اپنے سوالات اردو زبان میں لکھ کر بھیجے تو اسمبلی کے سکرٹری نے انہیں واپس کر دیا اور ہدایت کی کہ انگریزی زبان میں سوالات بھیجے۔[1] اسمبلی کی کارروائی قلمبند کرنے کے لئے ہندی رپورٹر تو رکھا جا سکتا ہے مگر اردو رپورٹر رکھنے اور اردو میں کارروائی شائع کرنے کے لئے بجٹ میں گنجائش نہیں نکلتی۔ اسمبلی میں کانگریس کے کراچی ریزولیوشن کا حوالہ دیکر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ کارروائی اردو اور ہندی دونوں میں لکھی جائے تو کانگریسی حکومت کا وزیر عدل و انصاف جواب دیتا ہے کہ :-

> "جو لوگ کانگریس کو ایک قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے انہیں کانگریس کی کراچی والی تجویز پر ہماری توجہ مبذول کرانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں کیا حق ہے کہ اس تجویز کا حوالہ دیکر وہ ہم پر نکتہ چینی کریں۔ ہم اقلیتوں کے معقول مطالبے ماننے کو تیار رہ سکتے ہیں لیکن اس ترمیم میں مسلمانوں کی طرف سے جو مطالبہ کیا

[1] عبدالرحمن خاں صاحب کا مراسلہ۔ اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۷ء

گیا ہے وہ نہ تو معقول ہے اور نہ قابل عمل۔ کسی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ ایوان کی اکثریت سے نامعقول مطالبے منوانے کی کوشش کرے۔

مسلمان ممبروں کو اس وقت بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو اُردو میں تقریر کرلیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُردو خط صوبہ کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں بھی رائج نہیں، اسمبلی میں بھی اُسے رائج نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بے انتہا مصارف بڑھ جائیں گے۔"[1]

(۴) عمل کے ساتھ زبانوں پر بھی علانیہ یہ بات آگئی ہے کہ "قومی" زبان حقیقت میں "ہندی" ہے نہ کہ وہ "ہندوستانی" جو یوگوسلویا کی "سرب لوکروٹوسلافینی" زبان کی طرح محض ایک دھوکے کی ٹٹی بنائی گئی ہے۔ اس تخیلی زبان کے متعلق تو ابھی حال میں گاندھی جی نے خود فرما دیا ہے کہ خارج میں اس کا وجود کہیں نہیں ہے بلکہ وہ آئندہ پیدا کی جانے والی ہے۔[2] اب مقابلہ رہ جاتا ہے اُردو اور ہندی میں، تو اس کے متعلق "متحدہ ہندوستانی قوم" کے لیڈر کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیئے۔[3] ہری پورہ کانگریس کے موقع پر "راشٹر بھاشا سمیلن" (قومی زبان کی کانفرنس) کا ساتواں اجلاس مسٹر جمنا لال بزاز کے زیر صدارت ہوتا ہے اور کانگریس کا صدر اُس کو پیغام بھیجتا ہے کہ :-

---

[1] مدینہ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۳۸ء۔

[2] HINDUSTANI OF THE CONGRESS CONCEPTION HAS YET TO BE CRYSTALLISED INTO SHAPE (HARIJAN, 29 Oct. 1938)

[3] ہریجن بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۳۸ء۔

"صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے اور ہندی یا ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے ابھی تک ہندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنی چاہئے کہ یہ ہندوستانی قوم کی تعمیر میں مددگار ہوگی"[1]

یو۔پی کا وزیر تعلیم ۱۹ اگست ۱۹۳۸ء کو ناگری پرچارنی سبھا، بنارس کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو، جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، ہمارے جنوبی ہند کے ہموطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں"

اسی صوبہ کی اسمبلی کا صدر اسی وزیر تعلیم کے پاس وفد لے جاتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے پہلے اس کو سرکاری زبان قرار دیا جائے اور محکموں میں اور خصوصاً عدالتوں میں سارا کام ہندی کے ذریعہ سے ہو۔

(مدینہ یکم ستمبر ۱۹۳۸ء)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے متحدہ ہندوستان کے نام سے سیاسی طاقت حاصل کی ہے، اور اب یہ اس طاقت کو ہندوستان کی ایک قوم کی زبان مٹانے اور دوسری قوم کی زبان سارے ملک پر مسلط کر دینے میں استعمال کر رہے ہیں۔

یہ ساری روداد آپ کے سامنے ہے۔ اسے آنکھیں کھول کر پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ اس "جنگ آزادی" کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میرا

[1] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۸ء

قیدخانہ کا رفیق مجھ سے کہتا ہو کہ آؤ میں اور تم دونوں مل کر جیلر سے لڑیں اور ہم دونوں اپنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کاٹ پھینکیں۔ اگر معاملہ یہی ہوتا تو مجھ سے بڑھ کر کون احمق ہوتا کہ ایسے کارِ خیر میں اس کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتا۔ لیکن، یہاں صورتِ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ میرا رفیقِ زنداں اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے اور اپنے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈال کر مجھے اپنا قیدی بنالے۔ وہ مجھ سے تو کہتا ہے کہ آؤ اس قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جیلر سے لڑیں۔ مگر جیلر کے ساتھ یہ معاملہ طے کرتا ہے کہ حضور مجھے برقنداز بنا دیں، جیل کا انتظام حضور کے حسبِ منشا ہوگا اور قیدیوں کو میں قابو میں رکھونگا۔ اس طرح جو کچھ اختیارات اُسے جیلر سے ملتے جاتے ہیں اُن سے کام لے کر وہ اپنی قید کے طوق و سلاسل اُتار کر مجھے کستا چلا جاتا ہے۔ اور مزید غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے مگر یہ ہمارے رفیقِ زنداں صاحب جو اب برقنداز بنے ہیں، ان کو مردم خوری کا چسکا بھی ہے۔ یہ مجھے فقط اپنا قیدی ہی نہیں بنانا چاہتے بلکہ میرے گوشت اور خون کو آہستہ آہستہ اپنا جزوِ بدن بھی بنا لینے کی فکر میں ہیں۔ اب اگر میری عقل ماری گئی ہے تو میں ان کے ساتھ ضرور تعاون کرونگا تاکہ یہ میری مدد سے جیلر پر دباؤ ڈال کر اور زیادہ اختیارات حاصل کریں اور زیادہ آسانی سے مجھے نوشِ جان فرما سکیں۔ اور اگر میری جیسے کی آنکھیں پھوٹ چکی ہیں تو میں جیل کی کوٹھری میں بے فکر بیٹھا ان برقنداز صاحب کی ترقی کو دیکھتا رہوں گا۔ اور اگر جیل کی زندگی نے مجھے پست ہمت اور ذلیل بنا دیا ہے تو میں بوڑھے جیلر کی خدمت میں دوڑا ہوا جاؤنگا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرونگا کہ حضور کا دم سلامت رہے، جبتک آپ جیتے ہیں اُس وقت تک تو آپ ہی جیل کا انتظام فرمائیں، جب خدانخواستہ آپ کا وقت آن پورا ہوگا، اُسوقت

دیکھی جائے گی، جس کی قید بھی قسمت میں لکھی ہوگی بھگت لینگے لیکن اگر میں عقل و خرد سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہوں اور میری رگوں میں ابھی شرافت کا بھی خون باقی ہے تو میں ہمت کر کے اٹھونگا اور جیل کی دیواریں اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے کہ اس کوشش میں جیلر یا برقنداز کی گولی کا نشانہ بن جاؤنگا، تو بہت اچھا، مجھے اس کو گوارا کر لینا چاہیئے۔ قیدی کی زندگی سے، اور برقنداز کی غذا بننے سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ لڑکر مارا جاؤں۔ اس مردانہ کام میں دو ہی کا سہی مگر یہ امکان بھی ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نصیب ہو جائے اور میں اپنے مکار رفیقِ زنداں سے کہہ سکوں کہ برادرم! جیل کی ہوا بھول جاؤ اور سیدھی طرح شریف ہمسایہ بنکر رہو۔

نوٹ:۔ پرچہ کی کتابت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ۱۹ر نومبر کے زمزم میں جناب مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان نظر سے گزرا جس میں مولانا نے سی پی کے متعلق بعض شکایات کی تردید فرمائی ہے، اور بعض کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ جب وہ ان کے علم میں آئیں تو انہوں نے کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کو توجہ دلائی۔ اور اس نے ان کی تحقیقات یا تلافی کرنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بیان پر تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں مگر مختصراً میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن باتوں سے مولانا خود اطمینان حاصل فرما رہے ہیں اور جن پر مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں وہ درحقیقت قابلِ اطمینان نہیں ہیں۔ خود انکے اپنے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ اس سراسر غلط جمہوری نظام میں طاقت تو سمٹ سمٹا کر اکثریت کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اور ہماری اصلی حیثیت اب یہ ہے کہ اگر وہ ہم پر ظلم کریں تو ہمارا کوئی نمائندہ جاکر سردار پٹیل کی خدمت یا کسی اور سرکار کی خدمت میں عرض معروض کر دے، اور اس ظلم کی تلافی صرف اس وقت ہوسکے جبکہ

وہ بربنائے عنایت و مہربانی یا بربنائے مصلحتِ وقت تلافی کرنا چاہیں۔ یہ پوزیشن کسی طرح بھی اس غلامی کی پوزیشن سے مختلف نہیں جو اب تک انگریزی سلطنت میں ہمیں حاصل ہے۔ یہاں بھی کوئی مصیبت مسلمانوں پر پیش آتی ہے تو کوئی فضل حسین یا کوئی شفیع خود اس کا تدارک نہیں کر سکتا بلکہ جاکر وائسرائے بہادر سے عرض کرتا ہے یا کسی صوبہ کے گورنر صاحب کو توجہ دلاتا ہے، اور وہ اگر مہربان ہوں یا مصلحتہً اس کی ضرورت سمجھیں تو تدارک ہو جاتا ہے، ورنہ اکزیکٹو کونسل کے ممبر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں اور بدستور اس امید میں رکنیت کی کرسی سے چپکے رہتے ہیں کہ شاید کسی دوسرے موقع پر یہ منصب کام آجائے ہمارا اصلی اعتراض دراصل اسی پوزیشن پر ہے۔ مان لیا کہ کانگریسی حکومتوں میں اس وقت بڑی حق پسندی اور غایت درجہ کے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت ہو رہی ہے اور یہ بھی تسلیم کر لیا کہ جتنی شکایات اب تک اردو اخبارات میں شائع ہوئی ہیں سب کی سب جھوٹی ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ دستور کی نوعیت کیا ہے اور آئندہ کی لڑائی کس نوعیت کے دستوری ارتقا کیلئے ہو رہی ہے۔ اگر اس کی نوعیت یہی ہے کہ ہم اس جھوٹے جمہوری نظام میں محض اپنے سروں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے محکوم ہوں اور ہندو صرف اس لئے ہم پر حاکم ہوں کہ انکے سر ہم سے زیادہ ہیں، تو ظلم اس نظام کی عین فطرت میں پوشیدہ ہے۔ آج اگر مولانا ابوالکلام کی اس لئے سن لی جاتی ہے کہ ان سے کچھ زیادہ بڑا کام لینا ہے تو کل کسی ابوالکلام کی نہ سنی جائیگی اور کسی ابوالکلام میں یہ طاقت نہ ہوگی کہ جب اسکی نہ سنی جائے تو وہ کچھ کر سکے۔ ہمارا اصلی جھگڑا اسی طلِ اصول سے ہے اور مولانا یہ سمجھ رہے ہیں کہ بس تمام شکایات بیتوں کے مدرسے اور ودیا مندر کے نام اور ایسی ہی چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کے متعلق ہے۔ جو لوگ مولانا کے علم اور ان کی دانائی کے معترف ہیں وہ اس سے کچھ زیادہ دانشمندی و بصیرت کی توقع ان سے رکھتے تھے۔